18.4.81

بسمہ تعالیٰ

ENTERED
General Stock Register
Dated

5979

مقدمۃ القرآن

یعنی

تفسیری اصول

مؤلفہ

وجیہ الدین احمد خاں قادری
ناظم تعلیمات جامع العلوم فرقانیہ رامپور یوپی

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

٧٨٦
٩٢

General Stock Register
Dated

5070

مقدمۃ القرآن

یعنی

تفسیری اصول

مؤلفہ

وجیہ الدین احمد خاں قادری

ناظم اعلیٰ جامع العلوم فرقانیہ
بازار نصر اللہ خاں گنج۔ رامپور۔ یو۔ پی

مطبوعہ ناظم پریس رامپور

جملہ حقوق بحق مولف محفوظ ہیں

سال اشاعت ماہ ذیقعدہ مطابق نومبر ۱۹۷۶ء

بار اول ——————— ۵۰۰

طابع وناشر وجیہ الدین احمد خاں قادری رامپوری

طباعت ——————— ناظم پریس رامپور۔ یو۔ پی

ملنے کا پتہ
جامع العلوم فرقانیہ
بازار مسٹن گنج رامپور یو۔ پی

۷۸۶

گذارشِ بے نیائش

قرآن پاک کے مُنزّل من اللہ ہونے کی یہی دلیل کیا کم اہمیت رکھتی ہے کہ تقریباً چودہ سو سال گزرنے پر بھی مصحف صدیقی و عثمانی میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا اللہ تعالےٰ کے ارشاد گرامی "انا نحن نزّلنا الذکر وانا لہ لحافظون" کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سینوں اور ہاتھوں میں محفوظ ہے۔

دُنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی یہی کتاب مقدس ہے اور سچ تو یہ ہے کہ روز و شب کا کوئی لحہ بھی اس کی تلاوت سے خالی نہیں پریسوں کے قیام کے بعد ان ممالک میں جہاں مسلمانوں کی قابلِ ذکر آبادی ہے اس کے ہزارہا ایڈیشن کروڑوں کی تعداد میں نکلتے رہے ہیں جن میں بڑی تعداد ایسے ایڈیشنوں کی بھی ہے جو اپنی خوشنمائی دیدہ زیبی اور مختلف صنعتوں کے حامل ہونے کی وجہ سے اپنی نظیر آپ ہیں۔

یہی حال ملّت کے خطاطوں کا ہے انھوں نے اپنی خطاطی اور ترصیع و تذہیب کے وہ نادر نمونے پیش کئے ہیں کہ سیکڑوں برس گزر جانے پر بھی آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے۔

مصحف عثمانی پر حجاج بن یوسف نے اعراب لگوا کر عجمیوں کو جو عربی زبان سے ناواقف تھے تلاوت میں برابر کا شریک بنا دیا اور یہ قرآنی معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ آج تک کسی مصحف میں زیر، زبر، پیش کا فرق نہیں آنے پایا۔

یہ بھی قرآنی اعجاز ہی ہے کہ تحدّی اور چیلنج کے باوجود فصحاءِ عرب ایک چھوٹی سورت بھی اس جیسی نہ بنا سکے۔ بڑی جدوجہد اور سعی بلیغ کے بعد قرآن پاک کے تین الفاظ (ھُزُوا، کُبّار، عجاب) کو غیر فصیح قرار دے کر الزام لگایا گیا کہ خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب میں ایسے غیر فصیح الفاظ کیسے آسکتے تھے جب یہ خبر سرکارِ رسالت ؐ کے سمع مبارک تک پہنچی۔ چنانچہ ایک سن رسیدہ بزرگ حاضر خدمت ہوئے جب وہ قریب آئے تو حضور نے ایک جانب اشارہ کر کے فرمایا "تعال ھنا"، جب وہ اس طرف بیٹھنے لگے تو آپ نے دوسری طرف اشارہ کر کے فرمایا "تعال ھنا" اسی طرح دو تین بار ارشاد فرمایا گیا تو وہ بزرگ آگ بگولہ ہو گئے اور بڑے غصّے سے کہا! اَتَتَّخِذُنِیْ ھُزُوًا وانا شیخ کُبّارٌ ان ھذا لشیءٌ عجاب

سرکارِ دو عالم ؐ نے اپنی ظاہری بے اعتنائی پر معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کے اعتراض کا جواب قدرت نے دلا دیا۔

اعجاز قرآن قرآن پاک کو جس پہلو سے بھی دیکھا جائے گا سراپا اعجاز ثابت ہوگا۔ نفس اعجاز پر الباقلانی کا اعجاز القرآن الخطابی کا البیان فی اعجاز القرآن، الرازی کی نہایۃ الایجاز فی درایۃ الاعجاز، الرّمانی کی کتاب النکت فی اعجاز القرآن، اعجاز القرآن لعنایت رسول چریاکوٹی، اعجاز القرآن لابی الحسن البدایونی، اعجاز التنزیل للخلیفۃ محمد حسن التیالوی، اعجاز البیان فی لغات القرآن (اردو) از حافظ روح اللہ الاناوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علماءِ امت نے قرآن پاک کے جتنے پہلوؤں پر طبع آزمائی کی ہے ان کا احصا اس مختصر دیباچہ میں ممکن نہیں پھر بھی چند موضوعات پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔

لغات القرآن المفردات فی غریب القرآن الراغب، تحفۃ الادیب بما فی القرآن من الغریب لابی حیان، معجم آیات القرآن، تحسین النضارۃ غریب القرآن

المسمی بنزہۃ القلوب للسجستانی غریب القرآن لعبدالحی الصدیقی بدھانوی

تاریخ القرآن المقنع فی رسم مصاحف الامصار مع کتاب النقط لعثمان بن سعید کتاب المصاحف للسجستانی، تاریخ القرآن (اردو) از اسلم جیراجپوری،

اسباب النزول اسباب النزول للسیوطی، سہل الرسوخ فی علم الناسخ والمنسوخ لعبدالکریم، افادۃ الشیوخ بمقدار الناسخ والمنسوخ (فارسی) از صدیق حسن خاں قنوجی الناسخ والمنسوخ (اردو) از سخاوت علی جونپوری)

متعلقات القرآن الانصاف فیما بین العلماء من الاختلاف لابن عبدالبر، نصب المجانیق لنسف قصۃ الغرانیق للالبانی، نفحات القرآن للسبکی، التصویر الفنی فی القرآن للسید قطب، مشاہد القیامۃ فی القرآن للسید قطب، مباحث فی علوم القرآن لصبحی الصالح، القرآن والعلوم العصریۃ للجوہری الطنطاوی، تنزیہ القرآن الشریف عن التغییر والتحریف لعبدالباقی، جواہر القرآن للغزالی، الرائی الصحیح فی من ہو الذبیح للفراہی، بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز للفیروزآبادی تنزیہ القرآن عن المطاعن لقاضی القضاۃ مباحث فی علوم القرآن لمناع القطان رد الآیات المتشابہات الی الآیات المحکمات لمحمد، تعداد الآیات والحروف والسور والسجدات نصیرالدین برہانپوری، معرفۃ اوقات الصلوۃ من القرآن سخاوت علی الجونفوری

قرونِ اولیٰ سے عجمی ممالک مسلمانوں کے زیرِ نگیں آنے شروع ہوئے ان کی زبان عربی نہ تھی۔ عرصہ کے بعد علماء ملت نے اس کے تراجم کی طرف توجہ کی اور فارسی، ترکی، پشتو، اردو اور دوسری ملکی زبانوں میں ترجمے کئے انگریزی زبان بین الاقوامی زبان بن چکی تھی اس لئے اس میں بھی متعدد ترجمے کئے گئے اور اب تک بیسیوں زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں

یہ بھی قرآنی اعجاز ہی ہے کہ تحدی اور چیلنج کے باوجود فصحاءِ عرب ایک چھوٹی سورت بھی اس جیسی نہ بنا سکے۔ بڑی جد وجہد اور سعی بلیغ کے بعد قرآن پاک کے تین الفاظ (ہُزُوا، کُبّار، عجاب) کو غیر فصیح قرار دے کر الزام لگایا گیا کہ خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب میں ایسے غیر فصیح الفاظ کیسے آسکتے تھے جب یہ خبر سرکارِ رسالت صلعم کے سمع مبارک تک پہنچی۔ چنانچہ ایک سن رسیدہ بزرگ حاضر خدمت ہوئے جب وہ قریب آئے تو حضور نے ایک جانب اشارہ کرکے فرمایا "تعال ہنا" جب وہ اس طرف بیٹھنے لگے تو آپ نے دوسری طرف اشارہ کرکے فرمایا "تعال ہنا" اسی طرح دو تین بار ارشاد فرمایا گیا تو وہ بزرگ آگ بگولہ ہو گئے اور بڑے غصے سے کہا! اَتَتَّخِذُنی ہُزُوا و انا شیخ کُبّار ان ہذا لشئی عجاب

سرکارِ دو عالم نے اپنی ظاہری بے اعتنائی پر معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کے اعتراض کا جواب قدرت نے دلا دیا۔

اعجاز قرآن قرآن پاک کو جس پہلو سے بھی دیکھا جائے گا سراپا اعجاز ثابت ہو گا۔ نفس اعجاز پر الباقلانی کا اعجاز القرآن الخطابی کا البیان فی اعجاز القرآن، الرازی کی نہایۃ الایجاز فی درایۃ الاعجاز، الرمانی کی کتاب النکت فی اعجاز القرآن، اعجاز القرآن لعنایت رسول چریا کوٹی، اعجاز القرآن لابی الحسن البدایونی، اعجاز التنزیل للخلیفہ محمد حسن التیالوی، اعجاز البیان فی لغات القرآن (اردو) از حافظ روح اللہ الاناوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علماءِ امت نے قرآن پاک کے جتنے پہلوؤں پر طبع آزمائی کی ہے ان کا احصا اس مختصر دیباچہ میں ممکن نہیں پھر بھی چند موضوعات پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔

لغات القرآن المفردات فی غریب القرآن الراغب، تحفۃ الاریب بما فی القرآن من الغریب لابی حیان، بجم آیات القرآن تحسین الضیاء غریب القرآن

۳۳ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ فصحاءِ عرب اپنے میں سے افصح الفصحاء کا انتخاب کرکے بات کرنے کے لیے بھیجیں۔

المسمی بنزہۃ القلوب للسجستانی غریب القرآن لعبدالحی الصدیقی بدہانوی

تاریخ القرآن المقنع فی رسم مصاحف الامصار مع کتاب النقط لعثمان بن سعید کتاب المصاحف للسجستانی، تاریخ القرآن (اردو) از اسلم جیراجپوری،

اسباب النزول اسباب النزول للسیوطی، سہل الرسوخ فی علم الناسخ والمنسوخ لعبدالکریم، افادۃ الشیوخ بمقدار الناسخ والمنسوخ (فارسی) از صدیق حسن خاں قنوجی الناسخ والمنسوخ (اردو) از سخاوت علی جونپوری)

متعلقات القرآن الانصاف فیما بین العلماء من الاختلاف لابن عبدالبر، نصب المجانیق لنسف قصۃ الغرانیق للالبانی، نفحات القرآن للسبکی، التصویر الفنی فی القرآن للسید قطب، مشاہد القیامۃ فی القرآن للسید قطب، مباحث فی علوم القرآن لصبحی الصالح، القرآن والعلوم العصریۃ للجوہری الطنطاوی، تنزیہ القرآن الشریف عن التغییر والتحریف لعبدالباقی، جواہر القرآن للغزالی، الرائی الصحیح فی من ہو الذبیح للفراہی، بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز للفیروزآبادی تنزیہ القرآن عن المطاعن لقاضی القضاۃ مباحث فی علوم القرآن لمناع القطان رد الآیات المتشابہات الی الآیات المحکمات لمحمد، تعداد الآیات والحروف والسور والسجدات لنصیر الدین برہانپوری، معرفۃ اوقات الصلوٰۃ من القرآن سخاوت علی الجونفوری

قرونِ اولیٰ سے عجمی ممالک مسلمانوں کے زیرنگیں آنے شروع ہوئے ان کی زبان عربی نہ تھی۔ عرصہ کے بعد علماء ملت نے اس کے تراجم کی طرف توجہ کی اور فارسی، ترکی، پشتو، اردو اور دوسری ملکی زبانوں میں ترجمے کئے انگریزی زبان بین الاقوامی زبان بن چکی تھی اس لئے اس میں بھی متعدد ترجمے کئے گئے اور اب تک بیسیوں زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں

تراجم کے ساتھ ہی عجمی زبانوں میں تفاسیر کی ضرورت بھی محسوس ہوئی جب کہ عربی زبان میں قرنِ اول ہی سے اس کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی تفسیر تنویر المقیاس منصۂ شہود پر آ چکی تھی۔ صحابۂ کرام میں یہ پہلی تفسیر تھی۔ ویسے صحابہ کرام میں خلفاء راشدین، ابنِ مسعود، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابی موسی الاشعری، عبد اللہ بن الزبیر، انس بن مالک، جابر، ابو ہریرہ اور عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضوان اللہ علیہم اجمعین کا شمار بھی مفسرین میں تھا۔

تفسیر میں قرآن کی آیات سے قواعد مبادی علوم عربیہ، اصول کلام، اصول فقہ، علم الجدل وغیرہا سے طاقت بشریہ کے مطابق بحث ہوتی ہے۔ اس کی غرض معرفت نظم قرآن بقدر طاقۃ بشریہ ہے اور فائدہ صحیح احکام شرعیہ کے استنباط پر حصول قدرت ہے اور موضوع کلام الٰہی ہے۔

تفاسیر مختصر و متوسط و مطوّل لکھی گئیں۔ تفسیر جلالین و تفسیر الواضح للرازی وغیرہما پہلی قسم میں ہیں دوسری قسم میں الوسیط للواحدی و الکشاف للزمخشری وغیرہما ہیں۔ تیسری قسم میں التفسیر الکبیر للرازی و تفسیر الطبری لابن کثیر و فتح القدیر للشوکانی وغیرہا ہیں۔ سواطع الالہام لابی الفیض الفیضی بصنعت اہمال قابل ذکر چیز ہے۔ پوری تفسیر میں نقطہ کا کوئی حرف نہیں عربی تفاسیر سیکڑوں سے متجاوز ہیں۔ فارسی تفاسیر بھی کچھ کم نہیں، بطور نمونہ چند تفاسیر فارسی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

فارسی تفاسیر تفسیر حسینی مسمّٰی بہ مواہب علیہ از کاشفی، البحر المواج از قاضی شہاب الدین دولت آبادی، تفسیر جہانگیری از نعمت اللہ النارنولی، زیب التفاسیر از صفی الدین الاردبیلی الکشمیری، تفسیر مرتضوی از زین الدین شیرازی، تفسیر مصطفوی از غلام مصطفےٰ التھانیسری، نظم الجواہر از مفتی ولی اللہ فرخ آبادی، معدن الجواہر

از ولی اللہ فرنگی محلی انصاری، معالمات الاسرار از محمد حسن الامروہوی، تفسیر القرآن از محمد سعید الاسلمی المدراسی، تفسیر القرآن از محمد اشرف اللکھنوی، تفسیر القرآن از یاد علی الحسینی الشیعی، لوامع التنزیل و سواطع التاویل از سید ابو القاسم الشیعی، و فتح العزیز از عبد العزیز محدث دہلوی

اُردو تفاسیر | اردو میں بھی تفاسیر کا خاصا ذخیرہ ہے۔ چند تفاسیر مندرجہ ذیل ہیں

موضح القرآن از عبد القادر محدث دہلوی، تفسیر رؤفی از رؤف احمد المجددی الرامفوری، تفسیر القرآن منظوم از غلام مرتضیٰ الہ آبادی، غایۃ البرہان فی تاویل القرآن از محمد حسن الامروہوی، تفسیر مرادی از مراد اللہ الانصاری السنبھلی، بیان القرآن از اشرف علی التھانوی، تفسیر قادری از فخر الدین اللکھنوی، فتح المنان فی تفسیر القرآن از عبد الحق دہلوی، مواہب الرحمان از امیر علی ملیح آبادی، تفسیر ثنائی از ثناء اللہ امرتسری، اکسیر اعظم از احتشام الدین مرادآبادی، تفسیر القرآن از سید احمد خاں، تفسیر وحیدی از وحید الزماں اللکھنوی، خلاصۃ التفاسیر از فتح محمد اللکھنوی، احسن التفاسیر از احمد حسن الدہلوی، تفہیم القرآن از ابو الاعلیٰ مودودی، اور ترجمان القرآن از امام الہند ابو الکلام آزاد۔ تفسیر نعیمی از مولانا نعیم الدین صاحب مراد آبادی

قرآن پاک وعظ و نصیحت ہی کی کتاب نہیں بلکہ مجموعۂ علوم و فنون بھی ہے۔ چشم بصیرت اور ذوق طبیعت شرط ہے ہر صاحب ذوق کو اپنے ذوق کا خزانہ اس میں ملے گا۔

مفسرین نے لسانی، علمی، لغوی ادبی اور دیگر مضامین و مباحث پر اپنے اپنے ذوق کے مطابق طبع آزمائی کی اور قرن اول سے اب تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے آٹھ ضخیم جلدوں میں تفسیر لکھی جو تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے جس میں اپنے زمانے کے مروجہ علوم فلسفہ منطق اور ہیئت وغیرہا کے مسائل کی اتنی بھرمار کی کہ محققین کو کہنا پڑا "فیہ کل شیء الا التفسیر"

محی الدین ابن العربی متوفی ۶۳۸ھ قاضی ثناء اللہ پانی پتی متوفی ۱۲۲۵ھ

اور شیخ علی المہائمی متوفی ۸۳۵ھ کی تفاسیر پر متصوفانہ رنگ غالب ہے۔
دور حاضر کے مشہور عالم جوہری طنطاوی کی تفسیر موجودہ سائنسی دور کی پوری
عکاسی کر رہی ہے۔

سید قطب شہید مصری کی تفسیر فی ظلال القرآن میں عصر حاضر کی سیاست کی
جلوہ گری ہے۔ یہ تفسیر ۳۰ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ حسین بن خالد الناگوری
کی تفسیر القرآن علی تراکیب نحویہ اور توضیح المعانی پر مشتمل ہے۔

کچھ مفسرین نے صرف احکام قرآنیہ کی تفاسیر لکھی ہیں۔ الجصاص کی احکام
القرآن، ملا جیون کی تفسیرات احمدیہ، صدیق حسن خاں قنوجی کی نیل المرام
فی تفسیر آیات الاحکام، سید علی الشیعی کی تفسیر آیات الاحکام، ناصر بن یحییٰ لعیا کی
الہ آبادی کی تفسیر آیات الاحکام اور عبد العلی نگرامی کی اردو تفسیر آیات الاحکام۔

اپنے مسلک کے مطابق ہر مفسر نے آیاتِ احکام کی تعبیر کی ہے
بدر الدین محمد بن رضی الدین العامری الشافعی متوفی ۹۲۰ھ نے پوری
تفسیر عربی نظم میں لکھی جس سے ان کی مہارت فن کا پتہ چلتا ہے۔

اصول تفسیر کی چند عربی و فارسی و اردو کی کتابیں بطور نمونہ درج ذیل ہیں

اصول التفسیر

فتح الخبیر بما لابد من حفظه من التفسیر از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
الفوز الکبیر فی اصول التفسیر (فارسی) از ولی اللہ محدث دہلوی المقدمۃ السنیۃ فی اصول
الترجمۃ وقواعدہا فی نقل القرآن من العربیۃ الی لسان آخر (فارسی) از ولی اللہ محدث دہلوی
الاکسیر فی اصول التفسیر (فارسی) از صدیق حسن خاں القنوجی، نثر المرجان فی رسم
نظم القرآن از محمد غوث المدراسی، جلاء الاذہان فی علوم القرآن (فارسی) از معین الدین
الکاظمی الکروی، البیان فی علوم القرآن (اردو) از عبد الحق الدہلوی، التحریر
فی اصول التفسیر (اردو) از سید احمد خاں۔

القرأۃ والتجوید | قرآن سے متعلق یہ فن سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر قرآن کا صحیح طور پر پڑھنا ناممکن ہے۔ ہمارے علماء نے اس پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔ اردو عربی فارسی ہر زبان میں اس موضوع پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں الشاطبیہ للشاطبی، الدر الفرید فی القرأۃ، التجوید لعبد الحق المحدث الدہلوی، مقصد القاری لنور الدین محمد، حلیۃ القاری لاحمد الحسینی، نہایات البیان (فارسی) از محمد دہلوی، معدن الاسرار (فارسی) از نظام بنارسی، الفصول العضدیہ لعنایت رسول چڑیاکوٹی، التحفۃ النذریہ (فارسی) از عبدالرحمن پانی پتی، سراج القراءۃ (اردو) از حافظ پیر محمد لکھنوی، زینۃ القاری (اردو) از کرامت علی جونپوری

علماء امت نے قرآن پاک کی ہر نہج سے جو خدمات انجام دی ہیں اس کی نظیر ملنا ناممکن ہے —— دیگر کتب سماویہ یا غیر سماویہ کی اس کے عشر عشیر بھی خدمت نہیں ہوئی ہے۔

مندرجہ ذیل فہرست سے محققین کی دیدہ ریزی کا اندازہ ہو سکے گا جو دوسرے صفحہ پر پیش کی جارہی ہے۔

تجزیہ قرآن

۱- پارے	۳۰	آیات بہ وعدہ	۱۰۰۰
۲- منزل	۷	” وعید	۱۰۰۰
۳- سور	۱۱۴	” امر	۱۰۰۰
۴- رکوع	۵۴۰	” نہی	۱۰۰۰
۵- ایات	۶۶۶۶	” مثال	۱۰۰۰
۶- کلمات	۸۶۴۳۰	” قصص	۱۰۰۰
۷- حروف	۳۲۳۷۶۰	” تحلیل	۲۵۰
۸- زبر	۵۳۲۲۳	” تحریم	۲۵۰
۹- زیر	۳۹۵۸۲	” تسبیح	۱۰۰
۱۰- پیش	۸۸۰۴	” متفرقہ	۶
			۶۶۶۶
۱۱- مدات	۱۷۷۱		
۱۲- تشدید	۱۲۷۴		
۱۳- نقاط	۱۰۵۶۸۴		
۱۴- سجدات	۱۴	(امام مالک کے نزدیک ۱۱ سجدات ہیں)	

حروف	
ا	۴۸۸۷۲
ب	۱۱۴۲۸
ت	۱۱۹۹
ث	۱۲۷۶
ج	۳۲۷۳
ح	۹۷۳
خ	۲۴۱۶
د	۵۶۰۲
ذ	۴۶۷۷
ر	۱۱۷۹۳
ز	۱۵۹۰
س	۵۹۹۱
ش	۲۱۱۵
ص	۲۰۱۲
ض	۱۳۰۷
ط	۱۲۷۷
ظ	۸۴۲
ع	۹۲۲۰
غ	۲۲۰۸
ف	۸۴۹۹
ق	۶۸۱۳
ک	۹۵۰۰
ل	۳۴۳۲
م	۳۶۵۳۵
ن	۴۰۱۹۰
و	۲۵۵۳۶
ھ	۱۹۰۷۰
لا	۳۷۲۰
ی	۴۵۹۱۹
	۳۲۳۷۶۰

صاحب تالیف اور ان کے کارنامے

استاذ العلماء حضرت مولانا الحاج شاہ وجیہ الدین احمد خاں صاحب قادری رامپوری نے پیش نظر رسالہ اصول تفسیر لکھ کر خواص و عوام کی بیش بہا علمی و مذہبی خدمت کی ہے۔

ابتداء میں وعظ و ارشاد کے انداز پر طویل خطیبانہ تمہید ہے بعد ازاں مختلف پہلوؤں سے قرآن پاک کی عظمت و برتری پر عالمانہ بحث فرمائی ہے ضمناً علمی و مذہبی مسائل بھی حل کرتے چلے گئے ہیں۔

نصف صدی سے زیادہ وعظ و ارشاد اور درس و تدریس مشغلہ زندگی رہا ہے، تقریباً ۸۰ سال عمر ہونے پر بھی علمی و دینی امور کی انجام دہی میں جواں ہمت ہیں۔

حضرت مولانا مدظلہم کی مرکزی شخصیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۸ سال قبل ۱۹۴۹ء میں بزمانہ پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور درگاہ حضرت سیدنا شاہ احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں ایک قرآنی مکتب قائم کیا جس میں ایک حافظ تعلیم دیتے تھے۔

مدرسہ عالیہ کی پرنسپلی سے ریٹائر ہونے کے بعد عربی کی ابتدائی جماعت بھی قائم کر دی۔ آج یہی پودا لہلہاتا ہوا تن آور درخت بن چکا ہے۔ احاطہ درگاہ میں درسگاہ کے لیے سہ رویہ دو منزلہ کشادہ کمرے بن چکے ہیں ایک دو منزلہ عمارت اقامت گاہ کے طور پر بھی بن گئی ہے جس میں تقریباً ۴۰ طلباء قیام پذیر ہیں جن کے قیام و طعام کا مدرسہ کفیل ہے۔ ۴ ذی استعداد مدرس مشغول درس رہتے ہیں۔

گذشتہ سال طلبہ کی مجموعی تعداد ۴۰۰ سو سے زیادہ اور مصارف ۶۵۸۹۷-۳۸

تھے جب کہ آمدنی ۱۰-۱۶۸۸۱ے تھی - آمدنی زیادہ تر اہل خیر حضرات کے عطیات سے ہوتی ہے۔ مقامی حضرات کے علاوہ بمبئی میں قیام پذیر باشندگان رامپور اور آسام میں حضرت مولانا کے کثیر تعداد تلامذہ وعقیدت مند مدرسہ کو نوازتے ہیں۔ اب یہ مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ کے نام سے معروف ہے۔

اللہ تعالےٰ حضرت استاذ العلماء کو فراغتِ قلبی نصیب فرمائے تاکہ آپ اپنی فاضلانہ تصنیف و تالیف سے آنے والی نسلوں کو استفادہ کا موقعہ بخش سکیں۔

عرصہ ہوا جب حضرت مولانا مدظلہ کا ایک رسالہ حدیثی اصول کے نام سے اشاعت پذیر ہوا تھا، اب پیش نظر رسالہ اصول تفسیر میرے سامنے آیا ہے ضرورت ہے کہ حضرت مولانا کا اشہب قلم کسی مستقل تصنیف کے میدان میں جولانیٔ طبع دکھائے تاکہ علم و فضل اور کہنہ مشقی کا فائدہ آئندہ آنے والی نسلیں اٹھا سکیں۔

از - محمد عبد الشاہد خاں شیروانی اسسٹنٹ لائبریرین
شعبۂ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

میری زندگی کے محبوب مشغلے دو رہے ہیں، ایک درس و تدریس دوسرے وعظ و تقریر میں نے کبھی تصنیف کی طرف توجہ نہیں کی لیکن اس سے پہلے اصول حدیث پر ایک مختصر سا رسالہ حدیثی اصول لکھا تھا۔ اس کے بعد اپنے مخلص مسرت حسین خاں صاحب آزاد کے اصرار پر ان کے رسالہ "الفاروق" کے لئے کچھ مضامین لکھے ارادہ تو تھا کہ پورے قرآن پاک کی تفسیر لکھوں لیکن تفسیر کے اصول اور اس کے متعلقات ہی لکھنے پایا تھا کہ یہ سلسلہ بعض ناگزیر حالات کے تحت رُک گیا۔ اب اس تحریر کو کتابچہ کی شکل دے رہا ہوں تاکہ علماء و طلباء فائدہ اٹھا کر مجھے دعاؤں میں یاد رکھیں :-

وجیہ الدین احمد خاں قادری رامپوری

۷۸۶

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وآلہ واصحابہ الطیبین الطاہرین - امابعد

دینِ حق

ہر طرف الحاد مواج ست چوں فوج یزید
دین حق ناچار بیکس ہمچوں زین العابدین

برادران ملت! اس دور پُر فتن میں جس طرح آبادی کی کثرت ہے، نظریات کی بھی انتہا نہیں۔ گویا جس قدر افراد بنی نوعِ انسان ہیں اسی قدر افکار اور نظریات بھی۔ اسی وجہ سے دنیاوی امور کے لیے جماعتیں بنتی ہیں اور پھر بعجلت بگڑتی ہیں۔ یہی حال دینی امور کا ہے۔ مخصوص نظریات کو ایک فرد یا ایک جماعت پہلے اپناتی ہے اور تھوڑے دنوں کے بعد اس سے منحرف ہو جاتی ہے۔ جس کی بے شمار نظیریں آپ کے سامنے ہیں۔ اس لیے دین میں انتشار پیدا ہوتا ہے، اور کسی صاحبِ دین کو اطمینان اور سکون حاصل نہیں ہوتا۔ بعض مواقع پر تو دل کسی ایک نظریہ پر مطمئن نہیں ہوتا لیکن مصالح کے تحت اس نظریہ کا حامی بنا رہتا ہے۔ اپنے ضمیر کے خلاف حمایت کرتا ہے۔ اور کھلی ہوئی چیز ہے کہ اس قسم کا نفاق باقی اور مخفی نہیں رہ سکتا، کسی نہ کسی دن بھانڈا پھوٹ جاتا ہے اور راز فاش ہو جاتا ہے۔

اِس قسم کی حرکت سے بڑے بڑے عزت داروں کی عزت خاک میں مل جاتی ہے اور ہمیشہ کے لیے اعتبار و اعتماد اُن پر سے اُٹھ جاتا ہے۔ پھر یہی نہیں کہ جو شخص اس طرح کے تذبذب و انتشار میں مبتلا ہو اسی کی ذلّت ہو، بلکہ دوسرے افراد پر بھی اعتبار نہیں رہتا اور ان کے لیے بھی یہی احتمالات رہتے ہیں کہ کس وقت یہ بھی اپنی ڈگر چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کر لیں۔

امورِ مذکورہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے حق پسند طالبِ رضائے الٰہی کے لیے ضروری ہے کہ وہ غور و فکر کرے کہ کس طرح انسان کو پائیدار اطمینانِ دینی حاصل ہو سکتا ہے اور کس طریقہ سے دینِ حق کی نعمت مل سکتی ہے۔ میں اس جگہ دوسرے مذاہب سے بحث کرنا نہیں چاہتا، بلکہ مدّعیانِ اسلام کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں

یہ تو آپ کے نزدیک امرِ مسلّم ہے کہ مذہبِ اسلام کا قانونِ بنیادی قرآن عظیم ہے اور اسی قرآن میں انسان کے لیے فلاحِ دارین کے ذرائع اور کامیابی و کامرانی کے طریقے مذکور ہیں۔ اس زندگی کی اصلاح اور مرنے کے بعد دوسرے عالم کی نجات کا راز اسی کتابِ روشن میں مضمر ہے۔ جملہ مدعیانِ اسلام نے اِسی کتاب کو اپنا ماویٰ و ملجا بنایا ہے۔ لیکن پھر بھی اَن گنت جماعتیں تیار ہو گئیں اور ہر شخص اور ہر گروہ کا دعویٰ ہے کہ میں قرآن پر عامل ہوں۔ اس انتشار کا سبب یہ ہے کہ بعض اشخاص اپنی عقلی روشنی سے کچھ خیالات اور نظریات قائم کر لیتے ہیں۔ پھر اس کے لیے قرآنی آیات کو اس پر منطبق کرتے ہیں۔ خواہ کسی قسم کی رکیک اور ضعیف تاویل ہی کرنا پڑے۔ تاویلات کا دروازہ اس قدر وسیع ہے کہ ہر حق شے کو باطل اور ہر باطل کو حق بنایا جا سکتا ہے۔

اس لیے جو تفسیریں فی زمانہ شائع ہو چکی ہیں آپس میں بعض مقامات پر متصادم ہیں۔ اس تصادم سے بچنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔ وہ یہ کہ جمہور سلف صالحین نے

کیا تفسیر کی ہے، اس شخص نے کیا کہا ہے جو جمہور کے نزدیک مسلّم ہے۔ غالبًا اس راہ کو اختیار کرنے کے بعد کوئی انتشار نہ رہے۔

بعض مقامات پر سلفِ صالحین کا قول ظاہری عقل کے خلاف ہوتا ہے، وہاں مدعیانِ عقل و خرد اُس قول سے ہی نہیں ہٹتے، بلکہ اُن بزرگانِ دین کی تحقیر و توہین میں بھی تامل نہیں کرتے۔ اِس تحقیرِ پیہم کا یہ اثر ہوتا ہے کہ مسلمان ایسی تنقید کے عادی ہو جاتے ہیں جو تنقیص آمیز ہوتی ہے۔ یہ تنقیص نتیجہ میں انسان کو بدگو اور بے تہذیب کر دیتی ہے۔ بظاہر نکتہ چیں یہ تصور کرتا ہے کہ "میں حامیِ حق ہوں" حالاں کہ وہ باطل پرستی اور بطلان پسندی کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ چیز اِس زمانہ میں عام طور پر مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں انتشار ہے اور طمانیتِ خاطر کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ یہ بے اطمینانی انسان کو کسی وقت ملحد و زندیق بنا دیتی ہے اور بجائے دینِ حق کی حمایت کے اُس پر تمسخر کے ساتھ حملے کرتا ہے اور بعض مواقع پر وہ اپنے حملہ آور ہونے کا معترف نہیں ہوتا ہے، لیکن معنوی اعتبار سے وہ حقانیت کی بیخ کنی میں سرگرم رہتا ہے۔ یہی چیز ترقی پاکر مسلمان کو حدِ کمیونزم کی طرف لے جاتی ہے۔ بہت سے خاندان اس کا شکار ہو چکے ہیں اور اب یہ دائرہ بتدریج وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

روسی اور چینی نظریات کی حمایت بہت سے مسلمان کھلم کھلا کر رہے ہیں۔ اِسلام اور اس کے دستورِ اساسی سے متنفر ہیں۔ اور اِن تمام خرابیوں کی بنیاد وہی آزادیٔ فکر ہے، جس پر اِس دور کا مسلمان فخر کرتا ہے۔

آزادی بھی ایک نعمت ہے، جس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دی جاتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ ہر آزادی نعمت ہے اور نہ ہر مقیدی قابلِ تحسین۔ موقع اور محل کے لحاظ سے کبھی آزادی نعمت ہے اور کبھی مقیدی۔

دانہ جو زمین میں بویا جاتا ہے اس کے لیے ایک وقت تک زمین میں مقیدی ہی

قابلِ تحسین اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ لیکن اُس کی پتیاں نمودار ہو جانے کے بعد اُس کے لیے آزادی کی ضرورت ہے کہ وہ زمین پر پھیل سکے اور اُس کی شاخوں اور پتّوں کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ لیکن جس وقت گرم ہوائیں چلیں یا برف باری ہو تو دوبارہ مقیّدی کی ضرورت ہے۔ اِس لیے ان مخالف حملوں سے بچنے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔

یہ ایک نظیر بطور تمثیل پیش کی گئی ورنہ بے شمار مقامات پر آپ کی اور آپ کے مزعومات کی حفاظت مقیّدی کی ہی رہینِ منت ہوتی ہے جس طرح بہت سے مواقع پر ارتقاء اور عروج کا مدار آزادی پر ہوتا ہے۔ الغرض دینِ حق اور دستورِ اساسی کی توضیح و تفسیر میں مسلمان جب تک سلفِ صالحین کا دامن نہ پکڑے، کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہم ایسے ہی مترجمین اور مفسرین کو ترجیح دیتے ہیں جو اِس مقیّدی کو پسند کرتے ہیں۔

میں انشاء اللہ تعالیٰ قرآن عظیم کے متعلق جو چیز آپ کے سامنے رکھوں گا وہ وہی ہوگی جو جمہور سلفِ صالحین کی مسلّمہ ہوگی یا کسی ایسے شخص کا قول ہوگا جو جمہور کی رائے پر چلنے والا ہو۔ وباللہ التوفیق۔

دینِ حق اور قرآن

اہلِ اسلام کے عقیدہ کے مطابق قرآن آسمانی کتاب ہے۔ عاداتِ انسانی سے اس قدر مافوق کہ بشری طاقت سے اس کی ترتیب ناممکن۔ جس کو ہم معجزہ کہتے ہیں۔ قرآن کے معجزہ ہونے پر جمہور مسلمین کا اتفاق ہے لیکن اعجاز کے وجوہ بیان کرنے میں بیانات متفاوت ہیں، جو تفسیر کی دوسری کتابوں میں مذکور ہیں اور جو مسلمانوں میں اونچے پایہ کا ادیب اور بلیغ گزرا ہے، اس نے بہترین پیرایہ میں قرآن عظیم کا معجزہ ہونا ثابت کیا ہے

علامہ جسر طرابلسی شامی نے اپنے رسالہ حمیدیہ میں بھی بڑی اچھی تقریر قرآن کے اعجاز کے متعلق کی ہے۔ علامہ سعدالدین تفتازانی نے تمام اقوال کا خلاصہ مختصر الفاظ میں ایک جا جمع کر دیا ہے۔ اس کے خلاصہ کی شرح کرتے ہوئے میں مختلف وجوہ کا تذکرہ کرتا ہوں۔ اِن وجوہ میں بعض چیزیں بھولے بھالے مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق قابلِ پذیرائی ہیں۔ بعض وجوہ کے سمجھنے کے لیے علمِ معانی اور علمِ بیان کے مسائل کا پیشِ نظر ہونا ضروری ہے۔ جس کے لیے علوم عربیہ: صرف، نحو، لغت، ادب وغیرہ سے واقف ہونے

کی بھی ضرورت ہے جس سے عام طور پر ناواقفیت ہے۔ بعض وجوہ عام فہم ہیں۔ بعض وجوہ موجودہ زمانہ کے اربابِ علم کے لیے قابلِ قبول ہیں، جو امام فخر الدین رازی نے اپنی تصانیف میں ذکر کیے ہیں۔ میں ہر ایک وجہ کو مفصل طور پر تحریر کرتا ہوں۔ جس کا مزاج جس طریقہ سے مانوس ہوگا وہ اُس پر غور کرے گا۔

کسی نے تو شانِ اعجاز بیان کرنے میں یہ کہا ہے کہ عربی زبان میں ۲۹ حروف ہیں ان حروف سے بے شمار الفاظ اور الفاظ سے بے شمار فقرے اور جملے بنائے گئے ہیں جو عرب قوم میں مستعمل تھے اور اب تک ہیں۔ ہر زبان میں مرورِ ایام اور دوسرے ممالک سے میل جول کی بنا پر تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے جو عربی زبان میں بھی ہوا۔ اس وقت کی دارجہ اور رائجہ زبان کو گویا سابقہ زبان سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ البتہ کتابی زبان جو اربابِ علم کی تصانیف میں استعمال کی جاتی ہے وہ ضرور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی زبان سے میل کھاتی ہے لیکن اُس دور کی فصاحتِ زبان و بلاغتِ بیان جو خصوصًا قومِ قریش کو حاصل تھی اور اس پر ناز کیا جاتا تھا اور یہ کہا جاتا تھا کہ زبان اس وقت ایسے بامِ عروج پر پہنچ گئی ہے کہ اس سے زائد ترقی ناممکن ہے، موجودہ زمانہ کی زبان سے کہیں بالاتر تھی، لیکن قدرتِ خداوندی کی انتہا نہیں۔ وہ در پردہ کہہ رہی تھی کہ بندگانِ خدا کو کمال حاصل ہے لیکن دیا ہوا ہمارا ہے۔ ہم نے اپنے کرم سے اپنے بندوں کو نوازا ہے لیکن خدا کسی کو نہیں بنایا اور نہ یہ ممکن ہے۔ ہماری قدرتِ کاملہ اور قوتِ کلامیہ ایسی لامتناہی ہے کہ انسان اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ باری تعالیٰ اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے یکتا ہے۔ اُس کی شان وحدہٗ لاشریک لہ ہے ؎

وہ بے دلیل ایک ہے اُس کی دلیل کیا
حاجت دلیل کی ہے نہ موقع دلیل کا!

اللہ جل شانہ وعم نوالہ نے قرآن کریم نازل کر کے دکھا دیا کہ یہ ہماری ہی قدرتِ کاملہ

ہے" کہ پورا عرب آجائے اور شعراء و ادباء اجتماع کے ساتھ مقابلہ کریں لیکن ہمارے قرآن کی مثل نہ بنا سکیں گے اور شانِ اعجازی میں خلل انداز نہ ہو سکیں گے۔ عرب قوم پر مختلف دور آئے اور ہر زمانہ میں اُدباء و فصحاء پیدا ہوتے رہے لیکن آج تک کسی نے مقابلہ نہیں کیا۔ اگر کسی نے مثلِ قرآن بنا دیا ہوتا تو مخالفِ اسلام اور دشمنِ دین سینہ اُبھار کر یہ کہتا کہ "یہ ہے قرآن کی مثل"۔ الغرض قدرتِ خداوندی اور قوتِ ایزدی نے قرآن کا مثل نہ بننے دیا۔ نہ وہ آئندہ بنانے پر کسی کو قادر ہی کرے گا۔ پورا قرآن بنا دینا تو کارِ دارد، ایک چھوٹی سی سورۃ کا مثل بھی اب تک نہ بنا سکے۔ اس کی وجہ قرآن کی فصاحت ہو یا غیبی قدرت، بہرحال مقابلہ ناممکن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرآن دائمی و قائمی ہے۔ اب بھی عدل و انصاف سے جو اس پر غور کرتا ہے وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ قرآن کو کتابِ آسمانی اور اسلام کو دینِ حق تسلیم کرے۔ چنانچہ بہت سے اربابِ علم اب بھی اپنے ادیان سے گریز کر کے دائرۂ دینِ حق میں داخل ہو جاتے ہیں۔ بعض بدنصیب یہ کہہ کر محروم ہو جاتے ہیں کہ "دین حقانی ہے، قرآن آسمانی ہے لیکن قومِ مسلم اپنی بدکاری اور بدکرداری کی وجہ سے اِس قابل نہیں کہ کوئی اُس میں داخل ہو"۔

اِس قدر کہنا تو صحیح ہے کہ مسلم قوم کا اخلاق گر چکا ہے، اور قوموں کی نظر میں اُس کا وقار باقی نہیں، لیکن مُسلم کا وقار گر جانے سے وہ بدقسمت اپنا وقار کیوں کھوتا ہے، مذہب رضائے الٰہی کے لیے ہوتا ہے اور عقبیٰ کے درست کرنے لیے۔ یہی اس کا اصل مقصد ہے اگرچہ دنیائے فانی بھی اس کے ذریعہ درست ہو جاتی ہے، نہ کہ اصلی مقصد دنیا اور اس کی عزت جو یہ خیال کرتا ہے۔ وہ غلطی پر ہے۔

بعض حضرات نے قرآنی اعجاز اس طریقہ سے ثابت کیا ہے کہ

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ منجم تھے نہ رمّال، لیکن مغیبات کی خبریں دیتے تھے اور وہ من و عن اسی طرح صادق ہوتی تھیں، جس طرح دی گئی تھیں۔ اِسی قسم کے

واقعات قرآن میں جابجا مذکور ہیں۔ دنیائے عرب نے کسی مقام پر یہ نہیں کہا کہ مدعیٔ نبوت نجومی ہیں یا رمّال البتہ کاہن ہونے کی تہمت ضرور لگائی۔ کاہن بھی غیب کی خبریں دیتے تھے لیکن کبھی وہ سچی ہوتی تھیں، اور کبھی جھوٹی۔ بخلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآنی اخبار کے کہ وہ کسی مقام پر کاذب ثابت نہیں ہوئیں۔ دوسرے کہانت میں کاہن کی عملی خباثت شہادت دیتی تھی کہ کاہن کا تعلق خبیث ارواح سے ہے۔ جن کو شیاطین کہا جاتا ہے۔ حاملِ قرآن خباثتِ طبع اور دنائتِ طبیعت سے کوسوں دور تھے۔ جس میں کذب و دروغ کی کچھ گنجائش نہ تھی اور ان تمام حالات کے پیشِ نظر قرآن کا مخبر عن الغیب ہونا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن عظیم کے معجز ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔"

امام فخرالدین رازی نے قرآنی اعجاز کو اس طرح ثابت کیا ہے کہ

"حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا مسلّم ہے۔ یعنی: آپ نے لکھا پڑھا نہیں تھا اور بلا اعانتِ غیر ایسی کتاب دنیا کے سامنے پیش کر دی کہ جس میں عقائد کی تصحیح اور اخلاق کی تہذیب نیز اعمال کی اصلاح موجود ہے۔"

"دنیوی نظام کے ساتھ آخرت کا انتظام بحسن و خوبی اِس کتاب سے نمایاں ہے۔ عملی زندگی کا ایسا خاکہ اس میں پیش کیا گیا ہے جس سے انسان کو ایسی شخصی حیات حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ وقار، عزت، راحت، آرام اور صحت و عافیت سب ہی کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اپنے تو یگانہ ہیں، بیگانہ اقوام میں بھی وہ محترم مانا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن پر صحیح معنیٰ میں جو عامل ہوتا ہے، وہ دوسروں کی نظر میں مذہبی حیثیت سے خواہ باطل پرست ہی مانا جائے لیکن دنیا اس کو عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس کا یہ اندازہ صحیح اور رانجہارویہ ذریعۂ ہدایت اور وسیلۂ تبلیغ بن جاتا ہے۔ حضراتِ خاصانِ خدا مختلف بلاد میں پہنچے اور اپنی اسی بلند و باوقار زندگی سے خلائق کے لیے

باعثِ رشد وہدایت بنی اور بے شمار انسانوں کو حلقہ بگوشِ اسلام بنالیا۔ اس تہذیبِ انسانی اور حسن اخلاق کی تعلیم کے ساتھ معاشرہ یعنی گھریلو زندگی قابلِ تحسین بنانے کے قوانین بھی اس کتاب میں مذکور ہیں۔ شوہر و بیوی کے تعلقات، اولاد و والدین کے معاملات کو استوار بنانے کے لیے اس کتاب نے وہ قوانین بیان کیے ہیں کہ انسان چین کی زندگی بسر کرسکتا ہے اور گھریلو خطرات سے محفوظ رہ سکتا ہے"۔

گھریلو زندگی کے علاوہ ایک اور زندگی ہے جس کو سیاسی اور ملکی زندگی کہا جاتا ہے۔ اس کا بھی اعلیٰ لائحہ عمل اس قرآن عظیم نے پیش کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ مسلمان پر خواہشاتِ نفسانیہ کا اس قدر غلبہ ہے کہ وہ قرآنی سیاست پر عمل کرنا اپنے لیے دشوار جانتا ہے۔ اس لیے ممالکِ اسلامیہ میں قانونِ قرآنی عام طور پر نافذ نہیں۔ اب کوئی عمل کرے یا نہ کرے، قرآن نے تہذیب اخلاق، تمدن اور سیاست کو بہترین انداز پر بیان کردیا۔

مذکورہ بالا مسائلِ حکمت کے ساتھ اُمم سابقین کی عبرت خیز تاریخ بقدرِ ضرورت قرآن نے جابجا پیش کی ہے۔ آئندہ کے لیے پیش گوئیاں بھی کی ہیں۔ طبعیات اور سائنس کے متعلق مفصل بحث تو نہیں کی لیکن اشارات اس کے لیے بھی اس میں موجود ہیں۔ اسی طرح علم ہندسہ اور حساب کے قواعد و ضوابط تصنیفی رنگ میں تو نہیں ذکر کیے لیکن ضمناً تذکرے اس کے بھی قرآن میں آہی گئے ہیں۔ علم جغرافیہ کو فنی حیثیت سے قرآن کا جز نہیں بنایا لیکن عالم کا جغرافیہ کسی نہ کسی نہج سے قرآن میں ضرور آگیا ہے۔ الغرض اصلاحِ انسان کے لیے جو کچھ بھی ضروری تھا اس کا تذکرہ مفصل یا بالاجمال کردیا گیا ہے۔ مختلف فنون و علوم کے تذکرے کسی مصلحت سے قرآن میں ضرور آگئے ہیں۔ لیکن پورا احصار اور احاطہ کی نہ ضرورت تھی اور نہ ہی کیا گیا۔ اسی طرح اس قرآن کریم میں کسی مقام پر وزن عروضی بھی آگیا ہے۔ کسی مقام پر مقفیٰ عبارت ہے؛ اس سے علم العروض والقوافی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ لیکن عروض کے تمام

اوزان اور قافیہ کے تمام اقسام کا ذکر کرنا بلا ضرورت تھا اور خواہ مخواہ کتاب آسمانی کی تطویل لاطائل تھی۔ اللہ جل شانہٗ وعمّ نوالہٗ نے قرآن عظیم میں انسان کی صلاح وفلاح کا تمام سامان فراہم کیا۔ جہاں تفصیل کی ضرورت نظر آئی' وہاں تفصیل فرمائی' جہاں اجمال کافی ہوا' وہاں اختصار سے کام لیا۔ الحاصل قرآن علوم کا حامل' فنون کا جامع' ضرورت کا کفیل' نجات کا ذمہ دار' اسرارِ ربانی کا علم بردار' حکم عالیہ کا آئینہ دار' حیاتِ انسانی کے جملہ گوشوں پر محیط' کرۂ ارض تمام اطراف کے لیے کافی وافی اور ہر زمانہ کے لیے ضروری اور نافع ہے۔ ارباب عقل' خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں' چشمِ انصاف وعدالت ونگاہِ بصیرت سے جب غور کرتے ہیں تو اس جامعیت اور کمال کا کسی طرح بھی انکار نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں۔ ایسی کتاب ایک ایسے شخص نے عالم کے سامنے پیش کی کہ جس کو نہ لکھنا آتا تھا نہ پڑھنا۔ نہ اُسے ایسی صحبت ملی تھی جس کے ذریعہ یہ سامان فراہم ہو جاتا اور کتاب مرتب کر لی جاتی۔ الغرض فی نفسہٖ اگر ایسی کتاب لکھے پڑھے مرتب بھی کر دیں لیکن ایسے ناواقف کی طرف سے اس کتاب کی اشاعت معجزہ نہیں تو اور کیا ہے"۔

امام رازی رحمتہ اللہ علیہ کی اس تقریر میں نہ مخصوص فصاحت کو دخل ہے نہ بلاغت کو اور نہ اخبار عن الغیب کو۔ محض جامعیت' آداب زندگی اور احاطہ علومِ ضروریہ پر اس کی بنا ہے۔

حفظِ قرآن

قرآن عظیم کا دولتِ عظمیٰ اور نعمتِ بیکراں ہونا تو جملہ اہلِ اسلام کے نزدیک مُسلّم ہے لیکن جمہورِ مسلمین کا یہی عقیدہ ہے کہ قرآنی مضامین جس طرح حیاتِ دارین کے لیے مشعلِ راہ ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی وہ جواہر پارے ہیں جن کا پڑھنا اور سننا بھی ایمانی تازگی اور روحانی نور کا ذریعہ ہیں بلکہ وہ نقوش جو الفاظ پر دال ہیں اور وہ کاغذ جس پر نقوش کندہ ہیں قابلِ تعظیم اور مستحقِ احترام ہیں۔ اس لیے بغیر وضو مصحفِ قرآنی کا چھونا، بغیر کسی غلاف کی آڑ کے درست نہیں؛ البتہ حفظ پڑھنے کی اجازت ہے۔ ہاں جنابت کی حالت میں حفظ پڑھنا بھی صحیح نہیں۔ یہ مسائل قرآن وحدیث سے مستنبط ہیں اور فقہ میں مشرح طور پر مذکور ہیں۔

اس دور میں بہت سے مدعیانِ علم اس امر کے قائل ہیں کہ محض الفاظ پڑھنا فضول اور لایعنی ہے۔ اس جسارت اور دیدہ دہنی کی وجہ وہی خود پسندی اور خود رائی ہے جس کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ سمجھ کر پڑھنا اہم نہیں! بلکہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ "ایک آیت کا سمجھ کر پڑھنا پورے قرآن کی تلاوت سے بہتر ہے" لیکن فی زمانہ سمجھنے کی صلاحیت رکھنے والی جماعت اس قدر قلیل

ہے، جس کا وجود بمنزلہ عدم ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت عجمی ہے۔ اور اس اکثریت میں عربی داں طبقہ کی مقدار بہت قلیل ہے۔ عرب قوم اگرچہ عربی زبان بولتی ہے لیکن قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے جن علوم کی ضرورت ہے وہ علوم عام طور پر قوم عرب کو بھی حاصل نہیں خاص کر زبان کے بگاڑ نے عربی تلفظ کا بھی دیوالہ نکال دیا۔ قال کو گال اور ثلث کو تلات اور اِنَّ یاجوج وماجوج کو اِن یاگوگا وماگوگا کہنے والے بے شمار عرب ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ بذریعہ علمِ تجوید الفاظ کے تلفظ کو درست کیا جائے اور بذریعہ علوم عربیہ معانی کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ لیکن مسلم قوم کا حال یہ ہے کہ لکھے پڑھے اشخاص نے انگریزی یا اردو ہندی میں جو تراجم لکھے ہیں، ان کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اپنے کو عالم بے بدل اور مجتہد زمانہ سمجھ لیتے ہیں۔ اپنے اجتہاد سے جدید تحقیقات کا اضافہ اپنا کمال سمجھ لیتے ہیں اور اس ساختہ کمال کو منوانے اور اس کو "وحی من اللہ" سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اگر کوئی بھی لب کشائی کرے تو اس کو "دقیانوسی" اور "پرانی لکیر کا فقیر" جیسے القاب دے کر اس پر قہقہہ بازی کی جاتی ہے۔ حالاں کہ ان کو یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ جس ہستی گرامی پر یہ قرآن اترا ہے انھوں نے کیا فرمایا ہے۔ اور وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو اُن کے فیضِ صحبت سے فیض یاب تھے، انھوں نے کیا مطالب بیان کیے ہیں۔ اور وہ ائمہ دین جن کو حدیث اور تاریخ اور دوسرے علوم ضروریہ کا علم تھا، انھوں نے کیا سمجھا ہے۔ بعض بے باک تو صحابہ اور ائمہ کو بھی اپنے مقابلہ میں طفلِ مکتب ہی سمجھتے ہیں۔ البتہ رسولِ خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ایسی بے باکی سے کام نہیں لیتے؛ لیکن حضورؐ سے جو احادیث مروی ہیں ان کو صحیح نہیں مانتے تعجب ہے کہ محدثین نے جن احادیث کی تصحیح کی ہے ان کو ضعیف کہنے میں تو تامل نہیں ہوتا لیکن موجودہ سائنس داں اور یورپین مضمون نگاروں پر اس قدر پختہ ایمان ہوتا ہے کہ وہ کچھ کہیں "آمنّا" اور "صدقنا" کہہ کر اس کو مان ہی لیا جاتا ہے۔

"بریں عقل و دانش بباید گریست۔"

بڑا خوش نصیب مسلمان

بڑا خوش نصیب مسلمان ہے جو قرآنی نقوش اور الفاظ کا احترام کرے من اوّلہ الی آخرہ قرآن کا حافظ ہو، علوم عربیہ اور فنونِ ادبیہ کا ماہر ہو، تواریخ نزولِ قرآن اور شانِ نزول سے واقف ہو۔ اور ان تمام امور کے ساتھ اس مسلمان میں ملکۂ استنباط ہو۔ کلیات بنا سکے اور جزئیات کا استخراج کر سکے۔ اگر اتفاق سے یہ عالم پورے قرآن کا حافظ نہ ہو تو کم از کم پانچ سَو آیات جو احکام کے متعلق نازل ہوئی ہیں، ان کا حافظ اور تین ہزار احادیث جو احکام کے متعلق عملاً یا قولاً آچکی ہیں وہ اُس کے پیشِ نظر ہوں۔ اس حصۂ مضمون میں نورالانوار، توضیح وتلویح وغیرہ کا خلاصہ ہے۔ ایسے شخص کو اصطلاح ارباب علم میں فقیہہ اور مجتہد کہتے ہیں۔

فقاہت اور اجتہاد

خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے جو امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں مخصوص طبقہ کو حاصل ہوئی عام طور پر مسلمان اس رتبہ تک رسائی نہ پا سکے۔ بہت سے ارباب علم علماء وصلحاء اور اتقیاء ہوئے لیکن درجۂ فقاہت تک نہ پہنچ سکے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

مَنْ اَرَادَ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا　　جس کے متعلق خدائے تعالیٰ بہتری چاہتا
یُفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ ہ　　ہے اس کو دین میں فقاہت اور سمجھ عطا فرماتا ہے

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے خوش ہو کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے

اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ اے اللہ! ابن عباس کو دین میں سمجھ عطا فرما

دوسرے مقام پر ان ہی عبداللہ بن عباس کے متعلق فرمایا ہے۔

اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْحِکْمَۃَ فِی الدِّیْنِ ہ اے اللہ! ابن عباس کو حکمت و دانائی دین میں مرحمت فرما۔

علامہ شامیؒ نے اپنی کتاب ردّ المحتار شرح درّ مختار کی پہلی جلد کے شروع میں فرمایا ہے

"یہ درجۂ اجتہاد چوتھی صدی ہجری تک باقی رہا۔ اس کے بعد ختم ہو گیا۔ یعنی علوم دینیہ کی ایسی مہارت جو عالم کو دفعاتِ قانون مرتب کرنے کی صلاحیت عطا کرے وہ باقی نہیں رہی"۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ "دنیا میں واقعات اور حالات کی کوئی انتہا نہیں اور روز بروز نئے حالات پیش آتے رہتے ہیں اور اس کے لیے جدید مسائل کی ضرورت ہے۔ اگر اجتہاد کا دروازہ بند مان لیا جائے تو اسلامی کام کس طرح انجام پائیں گے اور مسلمانوں کی ضرورت کس طرح پوری ہو گی؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ "اجتہاد کے دو مرتبے ہیں۔ ایک قوانین اور کلیات کا بنانا دوسرے بنے ہوئے قوانین کے مطابق جزئیات اور فروع کا برآمد کرنا۔ پہلا مرتبہ چوتھی صدی تک ختم ہو گیا۔ دوسرا مرتبہ باقی ہے اور جو علماءِ ماہرین میں ہمیشہ باقی رہے گا"۔

یہ تقسیم حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے اپنے رسالہ "الاسعاف" میں فرمائی ہے۔ چنانچہ اس دور میں اُسی کے مطابق مسائل بنائے جاتے ہیں اور بعض امور میں تفاوتِ دماغی کی بنا پر اختلاف بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ اختلاف عمل کرنے والوں کے لیے مضر نہیں۔ جس عالم کو وہ اپنی نظر میں معتمد جانتا ہے، اس کے قول پر عمل کرے۔ اس قسم

کا اختلاف کلیات اور قوانین کی ترتیب میں بھی ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے حنفیت، شافعیت مالکیت اور حنبلیت کی چار راہیں نکل گئی ہیں اور جمہور نے سب کو مقبولانِ بارگاہ اور حق پرست کہا ہے۔ البتہ اس پر جمہور کا اتفاق ہے کہ ان چار طریق کے علاوہ پانچواں طریقہ اختیار نہ کیا جائے ورنہ اُمّت محمدیہؐ میں انتشار پیدا ہو جائے گا اور نا اہل، اہل بن بیٹھیں گے جیسا کہ غیر مقلدین میں ہو رہا ہے۔ العیاذ باللہ

دوسرے مرتبہ کا مسلمان وہ شخص ہے جس میں کمالات مذکورہ تو نہ ہوں لیکن سلفِ صالحین کے مرتب کردہ قانون کو کماحقہ، سمجھے اور عام مسلمانوں کو راہِ عمل دکھا سکے۔ اس درجہ کے لیے عربی زبان کی واقفیت، کتب دینیہ کا مطالعہ، اور ایسی استعدادِ علمی کہ وقت ضرورت ہر دینی کتاب کا مطالعہ کر سکے اور معاملہ کی نوعیت کو سمجھ کر اس کے مطابق فتویٰ دے سکے۔

ایسے علماء ابھی عالم میں موجود ہیں لیکن دورِ حاضر کی بے ذوقی اور دین سے بے تعلقی کی بنا پر روز بروز کمی ضرور ہوتی جاتی ہے۔[1]

تیسرے مرتبہ کا مسلمان وہ ہے کہ وہ خود عربی زبان سے واقف نہ ہو۔ لیکن قرآن عظیم کے تراجم اس نے پڑھے ہوں۔ فقہ کی جو کتابیں اس کی مادری زبان میں علماء نے تصنیف کی ہیں، ان کا مطالعہ کیا ہو عقائد کے متعلق جو رسائل مرتب ہوئے ہیں، وہ بھی اس نے مطالعہ کیے ہوں تو اس کو اصطلاحاً عالم نہیں کہا جاتا ہے، لیکن دین سے واقف ضرور کہا جا سکتا ہے۔

---

[1] دوسرے بلاد اور ممالک کا پورا اندازہ نہیں۔ البتہ رامپور جس میں پچاس ساٹھ علماء اس قسم کے ایک وقت میں موجود تھے، علمی تنزل میں اس درجہ پر پہنچ چکا ہے کہ اس وقت چار یا پانچ سے زائد نہیں۔

خوش قسمتی اور بدنصیبی

حُسنِ اتفاق سے اگر ایسے علماء کی تصنیفیں اس کے ہاتھ آگئیں جو صحیح راہ پر چلے ہیں اور اہل سنت کا طریقہ انھوں نے نہیں چھوڑا ہے تو وہ کرم الٰہی سے کامیاب ہے۔ امید ہے کہ فلاحِ دارین کی دولت پاکر وہ دنیا میں سرفراز اور آخرت میں ناجی قرار پائے گا۔ اگر سوء اتفاق سے بدعقیدہ اربابِ علم کی تصانیف کا مطالعہ کر لیا اور اُن سے متاثر ہو کر اپنا طریقۂ کار جمہورِ اہلِ سنت کے خلاف قرار دے لیا تو وہ دنیا میں کچھ بھی ہو، عقبیٰ میں ناکام اور محروم رہے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّہٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ	"گروہ اعظم کے ساتھ رہو اور جس نے جدائی اختیار کی اس کو دوزخ میں تنہائی کی سزا ملے گی"

چوتھے مرتبہ کا مسلمان

وہ ہے کہ "خود پڑھا لکھا نہ ہو یا دینی علوم سے واقف نہ ہو اور دینی کتب کے مطالعہ کا موقع بھی اس کے ہاتھ نہ آیا ہو لیکن ضروریاتِ دینی میں وہ اربابِ علم سے زبانی احوال معلوم کرتا ہو یا اس کی قسمت جس طرف لے گئی اسی طرف چل دیا۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّ الْبَاطِلَ بَاطِلًا۔	اے اللہ! ہمیں حق کو حق سمجھنا اور باطل کو باطل جاننا نصیب فرما۔

ایسے اربابِ ذوق میں سے بھی بعض اشخاص حافظ قرآن ہوتے ہیں۔ الفاظ اُن کو یاد ہوتے ہیں۔ پڑھتے پڑھاتے ہیں لیکن مطالب کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں بعض لوگ ایسے حفاظ کے وجود کو بمنزلۂ عدم قرار دیتے ہیں اور استغفر اللہ یہاں تک

کہتے ہیں کہ "یہ فضول کام ہے۔ بے کار دماغ خراب ہوتا ہے"۔ اس کا قدرے تذکرہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے کہ یہ دیدہ دلیری ناواقفیت اور بے ذوقی کی بنا پر ہے۔ جسارت بے جا سے کام لینے والے خود غور کریں کہ اگر حفظِ قرآن کو بلا سمجھے ہوئے فضول کام کہا جائے گا تو گنتی کے حفاظ ہی رمضان المبارک میں مساجد کی رونق بن سکیں گے اور مساجد عام طور پر ختم قرآن کی نعمت سے محروم رہ جائیں گی۔ حالاں کہ اس قرآنی دولت کی بنا پر ہزاروں مسجدیں عبادت خداوندی۔ نماز تراویح سے پُر رونق نظر آتی ہیں، مسلمانوں کی روحوں میں اسلامی زندگی پیدا ہو جاتی ہے، اسلامیات کا چرچا ہو جاتا ہے، دل میں سوز و گداز کی آگ بھڑک جاتی ہے، عشق الٰہی کی آتش فروزاں انوارِ الٰہی اور تجلیاتِ ربّانی کا منظر دکھاتی ہیں اور نمازیوں کے چہرے پُر نورانیت کے آثار نظر آتے ہیں۔ بعض مسلمانوں کو اس امر کا ذوق بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ جس قرآن کے بلا سمجھے ہوئے پڑھنے میں یہ فوائد اور منافع ہیں، اس کے سمجھ کر پڑھنے میں کیا مراتب ہوں گے۔ وہ لوگ اگر عربی زبان نہ سمجھ سکیں تو کم از کم تراجمِ قرآن پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ ان کے لذائذ روحانی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے۔

بے سوچے سمجھے جو بات کہی جاتی ہے، اُس پر ادنیٰ عقل رکھنے والا بھی جب غور کرتا ہے تو اُس کو ہنسی آتی ہے۔ باوجود قلّتِ ذوقِ عبادت اب بھی ہزاروں لاکھوں مسلمان بلکہ کروڑوں نمازی ہیں اور ان کی اکثریت سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص کے ترجمہ سے بھی واقف نہیں ہے۔ بلکہ اکثر ائمہ مساجد بھی اس معاملہ میں کورے نظر آتے ہیں۔ کیا کسی عالمِ دین نے کہا کہ "مسجد میں فقط اُسی نمازی کو قدم رکھنے دیا جائے جو قرآن عظیم سمجھ کر پڑھے اور سمجھ کر سُنے۔ نہ ایسا ہوا اور نہ انشاء اللہ ایسا ہو سکے گا۔

اگر سمجھنے کی ترغیب دی جائے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ ترغیب بھی ہر جگہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس دور میں صحیح الفاظ یاد کر کے نماز درست کر لینا ہی ایک بھاری مسئلہ ہو گیا ہے چہ جائیکہ ہر مسلمان کو عالم بنا دیا جائے۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ:۔

عَالِمٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ۔ ایک عالم شیطان پر ہزاروں عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔

انصاف کا خون

یہ ہی لوگ جو بے سمجھے قرآن پڑھنے کو لغو اور فضول کہتے ہیں، کیا انھوں نے پورے قرآن کے مقاصد سمجھ لیے ہیں یا سمجھ سکتے ہیں بعض آیات قرآنیہ وہ ہیں جن کا مطلب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے سوا کوئی بھی یقینی طور پر نہ سمجھا ہے اور نہ سمجھ سکتا ہے۔ کیا ایسے اشخاص نے قرآن عظیم کے اس حصہ کی تلاوت چھوڑ دی ہے۔ جب خود بے سمجھے یہ تلاوت اپنے لیے جائز سمجھتے ہیں تو دوسروں کو محروم کرنا انصاف کا خون ہے یا نہیں۔

قرآنی آیات کے لفظی آثار

صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ آیۃ الکرسی کی تلاوت حفاظتِ جان و حفاظت اموال اور حفاظت اولاد کے لیے مفید ہے۔ کیا یہ لفظی برکات نہیں۔ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ سفر میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سورۂ الحمد پڑھ کر اس شخص پر دم کی جس کو سانپ یا بچھو نے ڈس لیا تھا۔ اس عمل سے بفضلہٖ تعالیٰ اس کو صحت ہو گئی۔ حضورؐ کو جب اِس واقعہ کا علم ہوا تو صحابہؓ کی تصویب کی۔ معتبر احادیث میں ہے کہ سورہ ملک یعنی تبارک الذی کی تلاوت عذابِ قبر سے نجات دینے والی ہے۔ بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ سورہ یٰسین کی تلاوت مردہ کے دفن کے وقت مفید ہے۔

اس قسم کی حدیثیں ببانگ دہل ہمیں رہنمائی کر رہی ہیں کہ الفاظِ قرآنیہ خود بخود بعض اوقات بعض امور کے لیے نفع رساں ہیں۔ کیا ایسی حالت میں بھی الفاظِ قرآن کو بے معنیٰ اور لایعنی قرار دیا جا سکتا ہے۔

دھوکہ کھانے کی وجہ یہ ہے کہ اِس دور میں محنت اور جانفشانی کا کام مسلمان

کے لیے بہت دشوار ہو گیا ہے۔ حافظ بننے کے لیے دماغ سوزی کی ضرورت ہے۔ وقت صرف کرنے کی حاجت ہے۔ حسب مراتب سالہا سال کی مشقت جب تک مسلمان برداشت نہ کرے حافظ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ سادہ لوح لکھے پڑھے چند آیتوں کے تراجم کتابوں میں دیکھ کر یاد کر لیتے ہیں اور اپنے کو عالم بے بدل سمجھ لیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے کہاوتیں کہی گئی ہیں کہ "چوہے کو ہلدی کی گرہ مل گئی تو اس نے ارادہ کیا کہ میں پنساری کی دوکان کروں گا۔"

جس طرح حفظِ قرآن کا مسئلہ دشوار ہے، عالم بننے کا مسئلہ اس سے زیادہ دشوار ہے۔ اس لیے زمانہ جدید کے ارباب علم یہ بھی کہتے ہیں کہ تحصیلِ علوم کے لیے قدیم نصاب کی طرف توجہ کرنا بے کار ہے۔ سہل اور مختصر کورس سے کام لیا جائے اور گراں کتابوں کو یہ کہہ کر میٹ دیا جائے کہ "ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ"

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے افراد اور ملّا نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے اشخاص زمرۂ علماء میں کیا اس مختصر اور سہل بینی کی وجہ سے علماء بنے تھے؟ نہیں، ہرگز نہیں!! مدتوں تک گراں بینی سے ان حضرات نے کام لیا تھا اسی لیے آج تک ان کی تصانیف کا چرچا ہے اور اُن ہی کو ماویٰ و ملجا بنایا جاتا ہے۔

مطالب کی صحیح تعبیر

میرا مقصد یہ نہیں کہ دنیا کا ہر مسلمان حافظِ قرآن اور ماہرِ دین ہو۔ یہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اہل اسلام کو اس بلند مقصد سے روکا نہ جائے اور اُن کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کی جائے۔ بلکہ بعض کو اس بار گراں کے اٹھانے کے لیے آمادہ کیا جائے۔ تاکہ مہارتِ علمی اور برکاتِ قرآنی باقی رہیں۔ اگر اسی طرح روز بروز انحطاط ہوتا چلا گیا تو حضور نبی کریم کا فرمان ہم پر، ہمارے کردار کی وجہ سے صادق آئے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ

"علم اٹھا لیا جائے گا اور اس کی یہ صورت نہ ہوگی کہ سینوں میں سے کھینچ لیا جائے۔ بلکہ علماء چل بسیں گے اور اُن کے جانشین پیدا نہ ہوں گے۔ اس لیے لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنالیں گے۔ وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیں گے۔"

اور اس دور میں یہی ہو رہا ہے۔

مشائخ کے جانشین وہ حضرات ہیں، جو تصوف کے نام سے آشنا نہیں، مفتیوں کے جانشین وہ ہیں، جو فقہ سے کوسوں دور، اماموں کے جانشین وہ، جو صحیح قرآن پڑھنے سے قاصر اور مدرسین کے جانشین وہ، جو کتاب کی صحیح عبارت بھی خود نہ پڑھ سکیں۔ اس لیے خانقاہیں اور مدارس دینیہ محض عمارت ہی عمارت کا نام رہ گئے۔

حریفان بادہ خوردند و رفتند۔
تہی خم خانہا کردند و رفتند۔

فہمِ قرآن

قرآن عظیم کو چند مقامات پر ''کتاب مبین'' یعنی 'کھلی ہوئی کتاب' کہا گیا ہے۔ اِس لفظ سے بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ '' قرآن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے' اور اس میں کسی دوسرے کی اعانت درکار نہیں ہے''۔ اس غلط فہمی سے بہت سے نتائجِ بد پیدا ہوئے ہیں۔ اور ہورہے ہیں۔ ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ فی الواقع ''قرآن کھلی ہوئی کتاب ہے'' لیکن اس کے مراتب ہیں۔ جو شخص علوم عربیہ اور لسانِ عرب سے واقف نہیں وہ کسی ایک جملہ کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتا۔ کیا کوئی صاحبِ عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ غیر عربی داں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ'' کا ترجمہ سمجھ سکتا ہے؟ اگر نہیں سمجھ سکتا' اور یقیناً نہیں سمجھ سکتا تو اُس کے حق میں قرآن کھلی ہوئی کتاب کہاں ہوئی؟ اس لیے مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کہ عربی زبان سے جو واقف ہے؛ اُس کے لیے قرآن عظیم کھلی ہوئی کتاب ہے۔ اور جو اِس سے واقف نہیں؛ اس کے لیے کھلی ہوئی کتاب نہیں۔ اگر کوئی شخص عربی زبان سے واقف ہے لیکن تاریخِ اِسلامی اس کے پیشِ نظر نہیں تو تاریخی واقعات میں اُس کا فیصلہ کرنا کہ فلاں بیان واقعہ کی ابتداء ہے' یا انتہاء' یا درمیان؛ اس کے لیے ناممکن ہے۔

اسلامی تواریخ کے علاوہ اگر کوئی اُمم سابقہ کے واقعات سے ناواقف ہے تو وہاں یہ فیصلہ کرنا کہ ''کس قدر حصہ قابلِ سکوت ہے اور کس قدر قابلِ بحث اس کے لیے ناممکن ہے۔ اس طرح وہ شخص جو احادیثِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ناواقف ہے' اس کے لیے ترجمۂ قرآن

اور تفسیرِ قرآن دونوں مخدوش ہیں۔ چوں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سمجھنے کا کوئی حق دار نہیں۔ اگر کسی نے ظاہری عربی دانی کی بنا پر کسی سورت کی ایک تفسیر کر دی لیکن قوی حدیث اُس کے خلاف ہے تو کیا صحیح حدیث مفید رہے گی یا اُس کی ذاتی رائے ؟

بعض مقامات پر حضورؐ سے کوئی روایت دستیاب نہیں ہوتی ہے لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے آیاتِ قرآنیہ کی تفسیریں منقول ہوئی ہیں۔ ایسے مقامات پر اقوالِ صحابہؓ اور اعمالِ صحابہؓ سے مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض مقامات پر صحابہ علیہم الرضوان کے اقوال مختلف ہوتے ہیں۔ وہاں ایک قول کو ترجیح دینے کے لیے قوتِ اجتہاد اور ملکۂ استنباط کی ضرورت ہے جو ہر مسلمان میں نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر عالم میں بھی نہیں ہوتا۔ اِس لیے اہم ضرورت ہے کہ مفسّر اصولِ تفسیر سے واقف ہو یا کسی کا مقلّد ہو۔

سلفِ صالحین نے جن اصول کو پیشِ نظر رکھ کر قرآن کی تفسیر کی ہے، وہ حسبِ ذیل ہیں

تفسیرِ قرآن کے تین طریقے

قرآن کی تفسیر قرآن سے

اصل اوّل یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے۔ یعنی قرآنی حصّہ ایک مقام پر مجمل ہے اور دوسرے مقام پر مفصّل۔ تو مفصّل سے مجمل کو سمجھا جائے۔ مثلاً: سورۃ الحمد میں دعا مانگنے کا طریقہ تلقین کیا گیا ہے کہ بندہ خدا سے یوں دُعا مانگے:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ	اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا
صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ	جو راستہ ان لوگوں کا ہے جن پر تونے
غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ	انعام کیا ہے۔ نہ کہ اُن کا جن پر تیرا
وَلَا الضَّآلِّيْنَ	غضب ہے۔ اور نہ اُن کا جو راہ سے

سورہ فاتحہ　　بھٹکے ہوئے ہیں۔

اِس آیتِ کریمہ سے اُن لوگوں کی راہ طلب کی گئی ہے، جن پر خدا تعالیٰ کا احسان وانعام ہے۔ دنیا میں وہ کون سا انسان ہے جس پر خدا تعالیٰ کا احسان نہ ہو۔ کمی بیشی کا ضرور تفاوت ہے۔ دراصل کوئی شیٔ ایسی نہیں جو ممنون احسانِ خداوندی نہ ہو۔ کوئی شخص یہ کہے کہ مجھ پر کوئی احسان نہیں۔ تو کم از کم اُس کی ہستی اور وجود ہی ایک احسانِ عظیم ہے۔ لہٰذا آیتِ کریمہ میں اگر مطلق انعام مراد ہو تو درخواست بے سود ہے۔ اس لیے کہ دعا مانگنے والا خود حامل نعمتِ الٰہی ہے۔ پھر تحصیلِ حاصل کیوں کر رہا ہے اور بلا وجہ نمازوں میں اِس دعا کو بار بار کیوں پڑھتا ہے؟ اللہ جلّ شانہٗ اور اُس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک بے سود کام کرنے کی کیوں تلقین کی اور اگر یہ کہا جائے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر شیٔ اور ہر انسان ممنونِ احسان ہے۔ لیکن انعام کا اطلاق عام طور پر وہاں ہوتا ہے جس کو کوئی نمایاں مقام حاصل ہو۔ مثلاً کوئی شخص حسین وجمیل ہو یا صاحبِ فضل وکمال ہو یا دولت ومال کا مالک ہو۔" اس بنا پر دُعا کا مطلب یہ ہوگا کہ " اے اللہ! مجھے کسی صاحبِ ثروت ومالکِ دولت کی راہ پر چلا خواہ وہ قارون ہی کیوں نہ ہو۔ یا صاحب کمال کی راہ پر چلا خواہ وہ مداری یا بہروپیا ہی کیوں نہ ہو۔ یا کسی حسین وجمیل کی راہ پر چلا خواہ وہ دہریہ اور بے دین ہی کیوں نہ ہو"۔ ظاہر ہے کہ یہ مُراد ہرگز نہیں ہے تو پھر مُراد اور مقصد اس دُعا سے کیا ہے؟ اس کی تفسیر قرآن عظیم میں دوسرے مقام پر وضاحت کے ساتھ کردی گئی ہے۔

باری تعالیٰ کا فرمانِ عالی ہے۔

وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ	جو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِينَ اَنْعَمَ	کرتے ہیں وہ اُن کے ساتھ ہوں گے جن
اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيّٖنَ	پر اللہ نے احسان فرمایا ہے۔ یعنی انبیاء

وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ	صدیقین شہدار اور صالحین

اِس آیت کریمہ نے یہ چیز واضح کر دی کہ درخواست، ہدایت و رہنمائی اور تلاشِ راہ سے ان لوگوں کا راستہ طلب کرنا مقصود رہے جو طبقات انبیاء یا خاصان خدا میں داخل ہیں۔

یہ طریقہ تفسیر طرقِ تفسیر میں سب سے اعلیٰ ہے۔ اُس کی نظریں وقت آنے پر انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے سامنے اور بھی آجائیں گی۔

قرآن کی تفسیر حدیثِ نبوی سے

دوسرا طریقہ تفسیر یہ ہے کہ کسی قوی اور صحیح حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کا مقصد بتایا جائے۔ یوں تو جملہ کتبِ حدیث میں کہیں کہیں قرآن کی تفسیر آہی جاتی ہے۔ لیکن امام بخاریؒ نے اپنی "اصح الکتب" میں اس کا بہت اہتمام کیا ہے اور مستقل ایک بحث "کتاب التفسیر" کے نام سے لکھی ہے۔ اسی طرح امام ترمذیؒ نے اپنی "جامع الترمذی" میں اس کا بہترین اہتمام کیا ہے اور امام بخاریؒ سے زیادہ تفسیر کی خدمت کی ہے۔ ترمذیؒ کا رتبہ اپنے استاد سے یقیناً کم ہے اور اُن کی کتاب کا مرتبہ بھی صحیح بخاری سے کہیں نیچا ہے، لیکن پھر بھی ایک مفسّر اور محدّث ہیں اور اُن کی کتاب کو امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے صحاح ستہ میں داخل کیا ہے تاہم ان کے شرائط؛ شرائط روایت اس قدر سخت اور اونچے نہیں جو بخاریؒ نے اختیار کیے ہیں اور اسی لیے ان کو سامانِ تفسیر زیادہ میسر آیا۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی غلط روی کا ایک واقعہ قرآن عظیم میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ	اس وقت کو یاد کیجیے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ پھر فراخی کے ساتھ کھاؤ اور دروازہ بستی]

سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ۔

میں جھکے دبے داخل ہو اور یہ کہو کہ ہمارا سوال گرا دینا ہے [یعنی جرائم کے معاف کر دینے کا سوال ہے] تم ایسا کرو گے تو ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور اچھے کام کرنے والوں کے لیے اضافہ کریں گے اور ظالموں نے وہ بات بدل ڈالی جو اُن سے کہی گئی تھی"

اس آیت کریمہ سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ رہنمائی کے خلاف بنی اسرائیل نے تبدیلی کی لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ تبدیلی کیا کی۔ اُس کی تفسیر سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام سے صحیح بخاری میں یوں منقول ہے کہ " بجائے دبے جھکے چلنے کے اپنے سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے چلے اور معافی کی جگہ کہنے لگے "حَبَّةٌ فِيْ شَعْرَةٍ" یعنی ہمیں بالی میں دانہ چاہیے"۔

یہ طریقہ تفسیر پہلے طریقہ کے مقابلہ میں اگرچہ رتبہ میں کم ہے لیکن آئندہ آنے والے طریقوں کے مقابلہ میں بہت قوی ہے۔ کیوں کہ قرآن کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ سمجھنے والا کوئی نہیں۔ بلکہ اُن کے برابر بھی نہیں۔

قرآن کی تفسیر اقوالِ صحابہ سے

تیسرا طریقہ تفسیر یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جو قرآن کا مطلب اور مقصد بتایا ہے اس کو مفید اور قابلِ اعتماد سمجھنے میں تامل نہ کیا جائے۔ بشرطیکہ صحیح روایت سے ان حضرات کا قول میسر آجائے۔ یہ حضرات زبان سے بخوبی واقف تھے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مبارک صحبت نے ان کے قلوب کو دین کے انوار سے منور فرما دیا تھا

بعض مقامات پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلاف آرا پایا جاتا ہے۔ وہاں ترجیح میں مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور ہر شخص میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی ایک رائے کو ترجیح دے کر اس پر عمل کرے۔ اس قسم کے مواقع پر مجتہدین اور ائمہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور عوام کو اُن کی تقلید سے مفر نہیں ہو سکتا۔

اُس کی مثال یہ ہے: قرآن عظیم میں ایک مقام پر یہ آیت کریمہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ	اور جو لوگ تم میں سے انتقال کریں
وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ	اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ
بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ	بیویاں چار ماہ دس دن تک
وَّعَشْرًا۔	انتظار کریں۔

یعنی شوہر کے مرجانے پر چار ماہ دس دن کی عدت ہے۔ اس میں قید نہیں کہ عورت حاملہ ہو یا غیر حاملہ۔ اس لیے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "حاملہ عورت کا بھی اگر شوہر مرجائے تو وہ بھی ۴ ماہ دس روز کی عدت پوری کرے۔ لیکن قرآن کریم میں دوسرے مقام پر یوں مذکور ہے۔

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ	حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے
اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ	کہ وضع حمل [یعنی بچہ پیدا] ہو جائے

اس میں یہ قید نہیں کہ عدت طلاق کی ہو یا موت کی۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض پیدا ہو گیا۔ ایک آیت یہ چاہتی ہے کہ حاملہ عورت عدت، وضع حمل سے پوری کرے گی۔ دوسری آیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ چار ماہ دس روز کی عدت گزارے گی۔ اس تعارض کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے یوں دور کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ آیت "وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ" بعد میں نازل ہوئی ہے اور چار ماہ دس دن والی آیت پہلے نازل ہوئی۔ اس لیے جو آیت بعد میں نازل ہوئی ہے وہ ناسخ ہے

اور جو پہلے نازل ہوئی وہ منسوخ ہے۔

بعض لوگوں نے اس مقام پر نسخ کا اطلاق نہیں کیا ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ "آیت مبارکہ "وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ" نے آیت "وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ" کی تخصیص کر دی ہے۔ یہ لفظی اختلاف ہے۔ اس مسئلہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔

امام بخاریؒ اپنی صحیح میں قدرے تفصیل سے اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "بعض صحابۂ کرام کا یہ خیال تھا کہ عورت کو غور کرنا چاہیے۔ جو مدّت زیادہ ہو، اس کو عدّت قرار دے۔ خواہ وہ چار ماہ دس روز کی ہو یا وضع حمل کی" غالباً ان کا یہ فتویٰ احتیاطاً ہوگا کہ عدّت گزرنے میں کوئی شبہ نہ رہے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ "عِدّت وضعِ حمل ہوگی" خواہ کسی قدر جلد وضعِ حمل ہو جائے"۔

حنفیہؒ نے ابن مسعودؓ کے قول کو دوسرے صحابہؓ کے اقوال پر ترجیح دی ہے۔ نیز اُس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے حضرت ابن مسعودؓ کی تائید مل گئی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت سبیعہؓ کے وضعِ حمل کا اعتبار کرتے ہوئے عدّت سے ۴۰ روز بعد نکاح کرا دیا تھا۔ اس واقعہ میں بظاہر قولِ صحابیؓ پر تقلید کا مدار ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تفسیر بھی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی ثابت ہے۔ جن صحابہؓ کو حضورؐ کا عمل معلوم نہیں ہوا تھا، انھوں نے وہی احتیاط اختیار کی تھی جس کا تذکرہ اوپر کر دیا گیا۔

بعض مقامات ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں محض صحابی کے قول پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے۔

"حضرت عمرؓ بن الخطاب، حضرت ابن عباسؓ کا بہت احترام کرتے تھے اور بڑوں میں ان کو شمار کرتے تھے۔ ایک روز حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے فرمایا۔

"اے خلیفۃ المسلمین ! آپ ابن عباسؓ کو ہم بڑوں کے برابر رکھتے ہیں۔ حالاں کہ ہمارے بیٹے اُن کے برابر ہیں [یعنی ہم معمر ہیں اور ابن عباسؓ ہمارے بچوں کے برابر ہیں"]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن عباسؓ کو طلب فرمایا۔ اُن کے آنے پر سب سے سورۃ "اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ" کی تفسیر دریافت کی۔ سب نے ظاہری مطلب بیان فرمایا۔ آخر میں امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ سے تفسیر دریافت فرمائی انھوں نے فرمایا کہ "هٰذَا اَجَلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یعنی اس سورۃ میں باری تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی وفات پر مطلع فرمارہا ہے"۔ حالاں کہ صریحی الفاظ میں اس کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا "جو علم ابن عباسؓ کا ہے وہی میرا ہے"۔ سب نے اس تفسیر کو تسلیم کرلیا۔ حالاں کہ ابن عباسؓ کے لیے نہ کوئی آیت تھی نہ حدیث۔ بلکہ ابن عباسؓ اور حضرت عمر بن الخطابؓ کی زیرکی اور دانائی کارفرما تھی۔ ابن عباسؓ کے لیے حضور صلعم نے دعا فرمائی تھی۔

اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ — اے اللہ! ابن عباسؓ کو دین میں سمجھ اور حکمت عطا فرما۔

اور حضرت عمرؓ بن الخطاب کے متعلق یہ فرمایا

میری امت میں عمرؓ وہ شخص ہے جس سے باتیں کی جاتی ہیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ ارادوں کا اُن کو الہام فرماتا ہے۔

....

اب تک میں نے تفسیر قرآن کے تین طریقے بیان کیے ہیں۔ اس مضمون کو وضاحت اور قدرے تفصیل سے عرض کرچکا ہوں۔

دوسرا طریقہ تفسیر: یعنی احادیث رسالت مآبؐ سے مضمون قرآن کو حاصل کرنا اس کے لیے حدیث اور اُس کے لواحق علوم کی ضرورت ہے۔ مفسر جب تک احادیث نبویؐ سے بخوبی واقف نہ ہوگا، تفسیر سے عاجز رہے گا۔

تیسرے طریقہ تفسیر میں اقوال صحابہ کرامؓ کو بیان کیا۔

اس کے لیے آثار صحابہؓ جاننے کی ضرورت ہے جو علم حدیث کا ہی مخصوص شعبہ ہے۔

"چوتھا طریقہ تفسیر اجماع اُمت ہے"

اُمت محمدیہ کے اجماع کا حجت ہونا علم کلام میں ثابت کیا گیا ہے۔ علم اصول فقہ میں بھی اس کی بحث مطوّل اور مفصّل مذکور ہے۔ اِن علوم میں جب تک مفسّر کو مہارت نہ ہوگی اس وقت تک تفسیر صحیح نہ کر سکے گا۔

"پانچواں طریقہ تفسیر قیاس مجتہد ہے"

قیاس مجتہد کا حجت ہونا جمہور مسلمین کے نزدیک مسلّم ہے۔ اس پر علم کلام میں دلائل مذکور ہیں اور اس کی طولانی بحثیں علم منطق اور علم اصول میں بسط و وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔

چھٹا طریقہ تفسیر عربی لسانیات کے اصول و ضوابط ہیں جو نزول قرآن کے وقت مرتب نہ تھے بلکہ عرب اس وقت طبعًا غیر شعوری طور پر اُن قواعد کے پابند تھے اور اُن کا ذوق طبعی خود بخود اس پر عامل تھا، ان کو مرتبہ علوم کی حاجت نہ تھی۔ البتہ جو خصوصیت خاص اور درجہ کمال کے حامل تھے، اپنے سے کم علم افراد کے مقابلہ میں امتیاز خاص رکھتے تھے۔ اُس کی مثال قرآنی تفسیر کا وہ حصہ ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بخاری شریف اور دوسری کتب احادیث میں مذکور ہے مثلاً حق سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ بلاشبہ صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی

شَعَائِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ — یادگاروں میں سے ہیں۔ جس نے حج
أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ — یا عمرہ کیا اس کے لیے کوئی مضائقہ نہیں
أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا۔ — کہ وہ صفا اور مروہ کا طواف کرے۔

اس آیتِ کریمہ سے بعض صحابۂ کرامؓ نے یہ سمجھا کہ صفا اور مروہ کے درمیان گردش ضروری چیز نہیں۔ اختیاری امر ہے جس کا جی چاہے کرے اور جس کا دل چاہے نہ کرے لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی ذہانت، تدبّر اور ادبی مہارت سے ثابت کیا کہ گردش ضروری ہے۔ اور اگر یہ گردش ضروری نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ یوں فرماتا:

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ لَّا — کوئی مضائقہ نہیں اس میں کہ وہ
يَطَّوَّفَ بِهِمَا۔ — گردش نہ کرے۔

واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ جاہلیت کے دور میں صفا اور مروہ پہاڑیوں پر دو بُت رکھے ہوئے تھے۔ مشرکین گردش صفا اور مروہ میں ان بُتوں پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ اسلام کی حقّانیت کا چراغ جب روشن ہوا اور شرک وکفر کی ظلمت دُور ہوئی تو وہ بت صَفا اور مروہ سے دور کر دیے گئے البتہ گردش کو باقی رکھا گیا۔ اس پر بعض صحابہ کرامؓ کو یہ خیال ہوا کہ غالباً ہمارا یہ عمل جاہلانہ تھا۔ اِس لیے بُت پرستی سے کنارہ کش ہوجانے کے بعد گردش بھی کوئی ضروری نہیں۔ اُس کے جواب میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ "بت پرستی امر قبیح تھا، وہ اِسلام نے میٹ دیا۔ صفا اور مروہ کے درمیان گردش، جو سنت ہاجرہ علیہا السلام ہے، وہ اب بھی احسن ہے اس کو باقی رکھا گیا ہے۔ اب یہ چیز کہ اس کی بقا درجہ لزوم میں ہے، یا استحسان میں، امرِ آخر ہے۔ اس کے لیے حدیث رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ثبوت ہے کہ وہ ضروری ہے۔ یہی حنفیہ کا مسلک ہے کہ سعی یعنی دوڑنا صفا اور مروہ کے درمیان

واجب ہے۔ اس تقریر سے ناظرین نے اندازہ کیا ہوگا کہ آیتِ قرآنیہ کے سمجھنے میں تاریخ اور علمِ ادب دونوں کو دخل ہے۔

تاریخ بہت ضروری اور وقیع فن ہے۔ تاریخِ اسلامی میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن مورخ کسی نہ کسی مذہب کو اختیار کیے ہوئے ہوتا ہے۔ یا دہریہ اور لامذہب ہوتا ہے۔ الغرض جو بھی اس کا مذاقِ طبع ہو اُس کی تصنیف میں اثر انداز ہوتا ہے۔ ابن خلدونؒ جو اسلام میں بہت معتمد اور معتبر مورّخ مانا جاتا ہے، اپنے مقدمۂ تاریخ میں بعض باتوں کا اس لیے انکار کرتا ہے کہ وہ اس کی عقل کے مطابق نہیں۔ فلسفی مزاج ہونے کی وجہ سے خطیب بغدادی کے بعض امور کو غلط کہتا ہے۔ لیکن فلاسفی اور سائنس کی ترقی نے بہت سے امور ایسے امور ثابت کر دیے ہیں جو خطیب بغدادی کے بیان کردہ اُمور سے بہت زیادہ عجیب ہیں۔ اس لیے تواریخ اسلامیہ میں اگر تعارض اور تصادم واقع ہو تو جمہور مسلمین کے نظریات کے مطابق فیصلہ کرنا ہوگا۔ تب ہی مسلمان نجات کی راہ پا سکتا ہے۔ ورنہ محض مورّخانہ تحقیق انسان اور مسلمان کو راہِ حق سے محروم کر سکتی ہے۔

لسانیات:۔ ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ امّ المومنین حضرت عائشہؓ نے اپنی لسانی ادبیت کے ذریعہ قرآن عظیم کا مقصد واضح کیا۔ حضرت عائشہؓ کے دور میں صرف ادبی ذوق ہی تھا۔ علوم کی ترتیب کا نام و نشان نہ تھا۔ علوم کی ایجاد اور تدوین کافی دیر سے عمل میں آئی۔ وہ علوم جن پر ادبِ لسانی کا مدار ہے، متعدد ہیں۔ لیکن سب سے پہلے لغت عربیہ سے واقفیت ضروری ہے۔ میری نظر سے جو کتابیں گزری ہیں ان میں سے میں نے "اقرب الموارد" کو بہتر پایا ہے۔ یہ حال کی تصنیف ہے جس کا ماخذ کتب قدیم ہیں، لیکن ترتیبِ بیان اور تصحیحِ معانی میں اس کا رتبہ بہت بلند ہے

لغت عربی میں وہی اشکالات ہیں جو ہر زبان کے لغت میں ہوتے ہیں۔ یعنی الفاظ بہت سے معانی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ اُن میں سے بعض کی تعیین قرائنِ عقلیہ اور نقلیہ

کی محتاج ہوتی ہیں۔ ایسے ہی مواقع پر مجتہدین میں اختلاف رونما ہو جاتا ہے۔ مثلاً قرآن عظیم میں ایک مقام پر آیا ہے

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ	مطلقہ عورتیں اپنی عدت گزارنے کے لیے تین "قروء" کا انتظار کریں۔

یہاں تک تو شوافع اور احناف کا اتحاد ہے۔ لیکن "قروء" سے مراد کیا ہے؟ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک "قروء" سے مراد حیض ہیں اور شوافع کے نزدیک طہر۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ لفظ "قروء" حیض اور طہر دونوں کے لیے لغتِ عرب میں مستعمل ہے اپنے اپنے اجتہادی قرائن سے مدعا کی تعیین کی ہے۔ لیکن حنفیہ کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک حدیث ہے، جو صحاح میں مذکور ہے۔ اُس میں حضورؐ نے کنیز کے متعلق فرمایا ہے۔

طَلَاقُ الْأَمَةِ ثِنْتَانِ وَ عِدَّتُهَا حَيْضَتَانِ۔	[مطلقہ] کنیز کی طلاق دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عدت کے لیے حیض کا اعتبار ہے، طہر کا نہیں۔ یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ محض لغت کا پہچاننا ہی تفسیر کے لیے کافی نہیں اگرچہ لغت کا جاننا ضروری امر ہے۔ کیوں کہ قرآن عظیم کا نزول لغت قریش کے مطابق ہوا ہے۔

<u>اختلافِ لغات</u>:- پورے عرب میں زبان عربی تو ایک ہی تھی، لیکن قبائل اور اطراف کے تفاوت سے لغتِ عرب میں تفاوت ہو گیا تھا اور یہ چیز ہر زبان میں ہی ہوتی ہے۔ مثلاً لکھنو اور دہلی کے ادبا، شعرا، اور قابلِ اعتماد اہلِ زبان میں اردو ہی مستعمل ہے۔ لیکن لکھنوی اور دہلوی تراکیب اور محاورات میں واضح فرق ہے۔ سیتاپور سے بنارس تک پوربی ہندی بولی جاتی ہے۔ لیکن ہر ضلع کا طرز و طور کچھ نہ کچھ جدا ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اسی لیے فرمایا ہے کہ

"جب آیات قرآنی کے مفہوم میں کچھ اختلاف پایا جائے تو لغت قریش کا اعتبار کرو کیوں کہ نزول قرآن قریشی زبان کے مطابق ہوا ہے۔"

علم صرف:۔ یہ علوم عربیہ میں مخصوص فن ہے جس کا جاننا مفسر کے لیے بہت اہم ہے۔ اگر علم صرف سے انسان واقف نہ ہو تو بہت سے مقامات پر فاحش غلطیوں میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ مثلاً عربی زبان کا مشہور لفظ "قَالَ" ہے۔ یہ لفظ اگر "قول" سے مشتق مانا جائے تو اس کی اصل "قَوَلَ" ہے۔ اور اس کے معنیٰ ہیں "اُس نے کہا" اور اگر "قیلولہ" سے مشتق مانا جائے تو اس کی اصل "قیل" ہے جس کے معنی ہیں "وہ دوپہر کو سویا" یا مثلاً دوسرا مشہور لفظ "سائل" ہے۔ اگر اس کو "سوال" سے مشتق مانا جائے تو اُس کے معنیٰ "مانگنے والا" اور اگر اس کو "سیلان" سے مشتق مانا جائے تو اس کے معنیٰ ہیں "بہنے والا"۔

علم تجوید: یہ وہی علم ہے جس کو علمِ قرأت کہتے ہیں۔ مفسر کے لیے ضروری ہے کہ اس فن سے بھی واقف ہو۔ ورنہ ترجمہ اور تفسیر میں اہم اغلاط میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً: قرآن مجید میں ہے۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (اے محمدؐ اللہ کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔)

اس میں "اِنْحَرْ" حائے حطی سے ہے۔ جس کا مخرج وسط حلق ہے اور اس کے معنیٰ قربانی کرنے کے ہیں۔ اسی لفظ کو اگر ہائے ہوز سے ادا کیا جائے جس کا مخرج انتہائے حلق ہے تو اس کے معنیٰ "جھڑکنا" ہیں۔ ان دونوں معنی میں کافی تفاوت ہے۔ بلکہ نماز کے فساد کا خطرہ ہے۔ اور اس کی بنا محض ادائے لسان ہے۔ ان طرقِ ادا کو پورے احصار کے ساتھ علم تجوید اور قرأت میں ذکر کیا گیا ہے۔

علم نحو:۔ یہ لسانی علوم میں ایک اہم فن ہے جس میں کلمہ کے اعراب اور کلمات کی ترکیب سے بحث کی جاتی ہے۔ اعراب کے بدلنے سے معانی میں بڑی تبدیلی آجاتی ہے۔

مثلاً اَعْطٰی زَیْدٌ دِرْہَمًا میں لفظ زید پر اگر پیش پڑھا جائے تو اس کے معنیٰ ہیں: "زید نے ایک درہم دیا" اور اگر اسی لفظ زید پر زبر پڑھ دیا جائے تو اس کے معنیٰ ہیں "زید کو ایک درہم دیا" اور اگر اسی طرح عبارت میں معمولی سا تفاوت بھی پیدا ہو جائے تو بڑا تغیّر رونما ہو جاتا ہے۔ مثلاً: کسی نے سوال کیا کہ "فلاں شخص کا کیا انتقال ہو گیا"؟ جواب میں دوسرے نے کہا "لا۔ وشفاہ اللہ" تو اس کے معنیٰ ہوئے "انتقال نہیں ہوا اور اللہ تعالیٰ اس کو شفا دے۔ اسی ترکیب میں اگر حرف 'و' نہ لایا جائے اور یوں کہا جائے "لَا شفاہُ اللہ" تو اس کے معنیٰ ہوں گے 'اللہ اس کو شفا نہ دے'۔

علم رسم الخط:۔ یہ فن جو طریقۂ کتابت سے بحث رکھتا ہے اس کی واقفیت مفسّر کے لیے دوسرے علوم عربیہ کی طرح ضروری ہے۔ رسم الخط سے عدم واقفیت کی بنا پر معانی میں ایسا تفاوت پیدا ہو جاتا ہے جو کبھی حدِ کفر تک پہنچ جاتا ہے۔ مثلاً قرآن عظیم میں ایک مقام پر ہے "لَاۡاِلَی اللّٰہِ تُحْشَرُوْن۔ یہاں لا کے ساتھ "الف" لکھا گیا ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا ہے [جیسے طرح انگریزی زبان میں 'کے' این آئی ایف نائف 'میں' 'کے' نہیں استعمال ہوتا ہے لیکن وہ پڑھا نہیں جاتا ہے]۔ اس کے اصلی معنیٰ یہ ہیں کہ "تم اللہ تعالیٰ کی طرف جمع کیے جاؤ گے"۔ اور اگر اسی 'لا' کو کھینچ کر الف ادا کر لیا جائے تو اس کے معنیٰ ہوں گے کہ "تمہارا حشر اللہ کے دربار میں نہ ہو گا"۔ یہ جملہ اسلامی عقائد میں کلمۂ کفر ہے۔

علم معانی:۔ یہ علم علوم بلاغت کا ایک مخصوص شعبہ ہے۔ اس میں ادائے مقصد کے لیے مختلف تراکیب کا استعمال اور اس میں مختلف نتائج کا ترتّب بیان کیا جاتا ہے ایک ہی مقصد کو اگر ایک ہی طرح ادا کیا جائے تو ایک نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور دوسری طرح اسی مقصد کو ادا کیا جائے تو دوسرا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ مثلاً خالی الذہن کو یہ

بتانا مقصود ہو کہ "اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"۔ تو اس سے یوں کہا جاتا ہے کہ "اللّٰہُ عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ لیکن کسی منکر سے گفتگو کی جائے تو یوں کہا جاتا ہے "اِنَّ اللّٰہَ عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"۔

یہ بہت اہم فن ہے۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ "بلاغت اسی علم پر منحصر ہے"۔ جو شخص اس سے واقف نہیں وہ بلیغ نہیں اور جو شخص بلاغت سے واقف نہ ہو وہ قرآن بلیغ کی کیا تفسیر کر سکتا ہے۔

<u>علم بیان</u>:۔ یہ فن بھی بلاغت کا اہم ترین علم ہے۔ اس میں تشبیہات استعارات اور کنایات کے مباحث بیان کیے جاتے ہیں۔ بعض تشبیہات صحیح ہوتی ہیں اور بعض غلط۔ بعض تشبیہات بلیغ ہوتی ہیں اور بعض غیر بلیغ۔ اسی طرح استعارات اور کنایات کا بھی حال ہے۔ قرآن عظیم نے جو تشبیہ استعمال کی ہے وہ صحیح اور بلیغ ہے، جو استعارہ اور کنایہ استعمال کیا ہے وہ بہت بلند و بالا ہے یہ طریقہ طاقتِ بشری سے باہر ہے۔ اور ہر قرآنی حصہ بقدر سورہ اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ مافوق العادت ہے جس کو اعجاز کہتے ہیں اور یہی جمہور اربابِ علم کا مسلک ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ نے قرآن کریم میں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں دنیا کو "مچھر، مکڑی، کھیل کود" کہا ہے۔ اس پر کفار نے نکتہ چینی کی تھی کہ خدا تعالیٰ جو ارفع و اعلیٰ ہے اس کی یہ شان نہیں کہ وہ مکھی و مکڑی کا ذکر کرے۔ اس کی تردید باری تعالیٰ نے قرآن میں اس طرح فرمائی:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَھَا	اللہ تعالیٰ اس سے نہیں شرماتا ہے کہ وہ مچھر یا اس سے فوق کو کہاوت بتائے۔

یعنی تشبیہ کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس کے متعلق کلام ہو رہا ہے اس کا لحاظ

کرکے تمثیل دی جائے نہ کہ متکلم کے مرتبہ کو ملحوظ رکھا جائے۔ بیان فرمانے والا یقیناً عظیم الشان رفیع المرتبت ہے لیکن وہ دنیا جس کا حال بیان کرنا مقصود ہے وہ فی نفسہٖ خود ہی حقیر ہے۔ اور خصوصاً آخرت کے مقابلہ میں لائی ہے۔

علم بدیع:۔ یہ شعبہ لواحقِ علم بلاغت میں سے ہے۔ اس میں حسنِ کلام کو دوبالا کرنے کے لیے قواعد بیان کیے جاتے ہیں۔ جن کو صنائع و بدائع کہا جاتا ہے۔ اس علم کے ذریعہ قرآن عظیم کے محاسن نمایاں ہوتے ہیں۔ جس سے قرآنی ادبیت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔ اس سے خدا تعالیٰ کے حبیب علیہ السلام کا کمال بیّن طور پر دنیا کے سامنے آجاتا ہے۔ یعنی جس شخص نے شاعری نہ کی ہو، مضمون نگاری سے اس کا سابقہ نہ پڑا ہو، اربابِ علم کی صحبت اسے نہ ملی ہو، کسی مدرسہ یا کالج میں اس نے پڑھا تک نہ ہو۔ بلکہ مزدوری پر باشندگانِ مکہ کی بکریاں چرائی ہوں؛ وہ ایسا کلام سنائے جس کو اونچے خطباء و بلغاء استعمال کرتے ہوں۔

مثلاً قرآن عظیم کی یہ آیت کریمہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سنائی:

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ اپنے رب کی کبریائی بیان کر

اس جملے کے حروف کو ملاحظہ فرمایئے اگر آپ اس کو منقلب کریں، تب بھی یہی جملہ بنتا ہے۔

اس میں اشارہ ہے کہ انسان آتے جاتے، چلتے پھرتے خدائے عزّ اسمہٗ کی تعظیم کرے اور اس کی شانِ کبریائی کا تذکرہ کرے۔ اس صنعت کو علم بدیع میں "ما لاینعکس بالانعکاس" کہتے ہیں یعنی جو جملہ منعکس کرنے کے بعد بھی نہ بدلے۔ جوں کا توں رہے۔

نمونہ کے طور پر مختلف علومِ لسانیہ اور فنونِ ادبیہ کے لطائف اور کوائف پیش کیے گئے۔ تمام علوم تو دیرینہ طلبِ علم کے محتاج ہیں۔ عربی میں یہ علوم بسط و وضاحت کے ساتھ مذکور ہیں

اردو داں حضرات اگر معمولی واقفیت حاصل کرنا چاہیں تو عبدالرزاق صاحب رامپوری کی "حدائق البلاغت" دیکھیں۔ اور مولانا نجم الغنی خاں صاحب مرحوم کی "بحر الفصاحت" کا مطالعہ فرمائیں یہ کتابیں

اِن تمام فنون کی ایجاد علمائے اِسلام نے عربی زبان اور قرآنی لسان کے لیے کی تھی۔ لیکن اُس کا فائدہ فارسی زبان کے ماہرین اور لسانِ اُردو کے واقفین نے بھی حاصل کیا۔ اور یورپی اقوام نے بھی اپنی زبانوں میں بھی اس سے فوائد حاصل کیے ہیں ـــ الغرض قرآن محض مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ پورے عالم کے لیے ایک احسان عظیم ہے۔ جس کے سمجھنے کے لیے علماء نے بے انتہا جدّ وجہد کی اور اُن کی سعیٔ بلیغ سے ہر ہر برِّاعظم کے باشندوں نے فائدہ اُٹھایا۔ خواہ وہ قرآن کو آسمانی کتاب مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں۔ اِسی طرح اِس کتاب کے ایسے معانی اور مقاصد، جو اِنسانیت سے تعلق رکھتے ہیں اور انسان کو شریف الطبع، صادق القول، عادل اور رحم دل بنانے والے ہیں، وہ بھی محض مسلمانوں کے لیے مفید نہیں، بلکہ پورے زمانے کے لیے نافع اور ہر مقصد کے لیے صالح ہیں۔ الغرض اِس نسخۂ شفا میں ہر مرض کا علاج ہے۔ اِس لیے باری تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿ہم ایسا قرآن اُتار رہے ہیں جو ہر مرض کے لیے شفا ہے اور جو مخصوص طور پر مومنین کے لیے رحمت ہے۔﴾

جو علوم لفظی حیثیات سے قرآنی خدمات انجام دیتے ہیں ان کا یہاں مختصر سا ذکر تو آپ کے سامنے آگیا لیکن فی الحال قرآن سمجھنے کے لئے متعدد علومِ معنویہ اور فنونِ عقلیہ کی حاجت ہے۔ جن میں سے علمِ کلام، علمِ تصوف، علمِ فقہ اور علمِ اصولِ فقہ بے حد ضروری ہیں۔

نزولِ قرآن کے بعد امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں بعض ایسے جلیل القدر

حقیقتاً فارسی اور اردو زبان کے لیے لکھی گئی ہیں۔ عربی زبان کے پورے فوائد ان کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتے۔ تاہم فصاحت و بلاغت کے اصول کا ضرور پتہ چلتا ہے۔

علمائے امت پیدا ہوئے جنہوں نے قرآن کی آیات سے صراحتاً یا اشارۃً علوم ایجاد کیے مثلاً علم عقائد کا پورا نچوڑ ایک جگہ جمع کر دیا گیا، اور وہ قرآن ہی سے زائد لیا گیا جس کا مجموعہ علم کلام کے نام سے موسوم ہو گیا۔ اخلاق انسانی کی تہذیب اور تحسین کے لیے جن قواعد کی ضرورت تھی اس کا بیشتر حصہ قرآن عظیم سے ہی لیا گیا ہے جو علمِ اخلاق اور علمِ تصوف کہلاتا ہے۔ اعمال بحیثیت اثبات" یعنی جن کا کرنا ضروری ہے۔ یا "بحیثیت نفی" یعنی جن سے دُور رہنا ضروری ہے بہ اگر بحث میں لائے جائیں تو اُس کا نام علمِ فقہ ہے اور اُس کا مفید اور موقر حصہ قرآن مجید سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔

علماء اور مفسرین میں بعض ایسے عالی دماغ، واقف اسرار، پاک باطن اور نیک طینت انسان ہیں جنہوں نے قرآن کو علوم کی مدد سے نہیں سمجھا بلکہ علوم کی ایجاد قرآن عظیم کی مدد سے کی۔ دوسرے درجہ کے وہ علماء ہیں کہ علوم کی ایجاد تو ان کے لیے بامداد قرآن دشوار ہے لیکن قرآن عظیم سمجھنے کے لیے علومِ معنویہ اور فنونِ عقلیہ کا استحضار ان کے لیے ضروری ہے۔ اگر یہ علوم مفسرین کے سامنے نہ ہوں تو بعض اوقات بڑے اغلاط میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ مثلاً: علماءِ علمِ کلام نے علمِ عقائد میں یہ مسئلہ واضح طور پر تحریر کر دیا ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام امراض و مصائب میں مبتلا ہو سکتے تھے اور ہوئے ہیں لیکن ایسا مرض جس سے لوگ گھن کھائیں اور اُن کے پاس بیٹھنے میں بھی کراہت محسوس کریں، انبیا کے لیے ناممکن ہے اور یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اس عالم میں اس لیے تشریف لائے تھے کہ لوگ اُن کی صحبت سے مستفیض ہوں اور اس قدر مانوس ہوں کہ دل جمعی کے ساتھ ان کی بات سُن سکیں۔ جب یہ مسئلہ مسلّم ہو چکا تو حضرت ایوب علیہ السلام کے حال میں اُن کے مرض کو اس طرح بیان کرنا کہ ان کے جسمانی زخموں میں کیڑے پیدا ہو گئے تھے اور جو کیڑا زخم سے گر جاتا تھا حضرت ایوب علیہ السلام اس کو اُٹھا کر زخم میں رکھ لیتے تھے اور کہتے تھے کہ تیری غذا

میرے بدن میں ہے۔ تو اِس کو چھوڑ کر کہاں جاتا ہے۔ یہ تفسیر علم کلام کے مسئلہ کے خلاف ہے۔ قرآن عظیم میں صرف اس قدر نازل ہوا ہے۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ	[اے محمدؐ] ہمارے بندے ایوبؑ کا ذکر
إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي	کیجیے۔ جس وقت انھوں نے اپنے رب کو
مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ	آواز دی تھی کہ مجھے مرض لاحق ہوا ہے
أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ۔	اور تو ارحم الراحمین ہے۔

اِس آیت میں صرف مضرتِ مرض کا ذکر ہے۔ زخموں کا کرم سے پُر ہونا کہیں سے کہیں تک مذکور نہیں۔ اس کی تفسیر میں ہماری نظر سے کوئی صحیح حدیث بھی اس مدعا پر شاہد نہیں ملی۔ نہ کسی مفسر اور مسلم ماہر علوم نقلیہ وعقلیہ کا کوئی قول ہمارے پیش نظر ہے۔ البتہ معمولی کتب میں یہ قصہ ضرور مذکور ہے اور جُہّال واعظین بھی اس قصہ کو خلائق کو رُلانے کے لیے دہراتے ہیں لیکن کوئی معتبر مفسر کبھی اس طرف توجہ نہیں کر سکتا

اِس طرح علم کلام میں قوی دلائل سے یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانیت سے منزہ ہے۔ نہ اس کے انسانوں کی طرح ہاتھ ہیں نہ چہرہ، نہ اس کے لیے کسی مکان کا ہونا صحیح ہے اور نہ اُس کا مکین ہونا درست ہے۔ اِس مسئلہ کے مسلّم ہو جانے کے بعد قرآن عظیم کی وہ آیات جن سے بہ ظاہر خدا کے لیے اعضاء کا ثبوت ملتا ہے۔ اُس کا ظاہری مطلب کسی طرح نہیں لیا جا سکتا ہے۔ ایسے مقامات پر صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو اجمالی طور پر اُن آیات پر ایمان لایا جائے اور تفصیل کے معاملہ میں خاموشی اختیار کی جائے۔ یہی طریقہ متقدمین : امام اعظم اور امام مالک، وغیرہ کا تھا یا اُن آیات کی ایسی تاویل کی جائے جس سے عقائد مسلّمہ پر کوئی اثر نہ پڑے۔ اِس طریقہ کو متاخرین نے اختیار کیا ہے۔ یہ چند مثالیں وہ ہیں جن سے یہ چیز صاف ہو گئی کہ مفسرین کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم کلام سے واقف ہوں یا اس

قدر بلند پایہ ہوں کہ علم کلام کے ایجاد کرنے میں اُن کو دخل ہو' دونوں صورتوں میں مفسرؒ غلطی سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

اِس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ علمِ کلام اور علم عقائد کا مفسر کے لیے جاننا کتنا ضروری ہے۔ اور اس کے ساتھ مفسرؒ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ علم فقہ سے بھی واقف ہو تاکہ اعمالی مسائل کی تفسیر میں اہل حق کی راہ سے بھٹک نہ جائے۔ اِس کی مثال اس آیت کریمہ سے واضح ہو جائے گی کہ جو قرآن کریم میں وارد ہے۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ — تم ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے
مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ — لیے جائز ہیں جو دو دو تین تین اور
وَرُبٰعَ — چار چار

اِس آیتِ کریمہ کے تین مدعا ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اعدادِ مذکورہ کو جمع کیا جائے اور تکرار کے ساتھ یعنی دو دو چار، تین تین چھ، چار چار آٹھ۔ اس صورت میں فرد واحد کے لیے بیک وقت "اٹھارہ" عورتیں جائز قرار پائیں گی۔ قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں اس قول کو خوارج کا مذہب بیان کیا ہے۔

دوسرا مدعا یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اعداد کو بلا تکرار جمع کیا جائے۔ یعنی دو، تین اور چار۔ اس صورت میں بیک وقت نو بیویاں ایک مرد کے لیے جائز قرار پائیں گی۔ یہ مدعا اِس سے زائد قوی ہو جائے گا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیک وقت نو بیویاں تھیں۔ قاضی صاحب موصوف نے اس کو شیعہ قوم کی طرف منسوب کیا ہے۔

تیسرا مدعا جو اہل سنت کے نزدیک صحیح ہے وہ یہ ہے کہ اعداد کو جمع نہ کیا جائے بلکہ مردوں کے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے تقسیم مراد لی جائے۔ یعنی کسی کو ضرورت ہو، دو شادیاں کرے۔ دوسرے کو اِس سے زائد کی ضرورت ہو تو وہ تین عورتوں

سے نکاح کر سکتا ہے کسی کے مصالح اِس سے بھی زائد ہوں تو وہ بیک وقت چار شادیاں کر سکتا ہے کثیر احادیث کی روشنی میں اجماعِ اہلِ حق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور آیت کو محاورہ لسانیہ پر محمول کرتے ہوئے اہلِ سنت نے فقہ میں فیصلہ کر دیا ہے کہ ایک مرد کے لیے چار سے زائد بیویاں کسی طرح جائز نہیں۔ اگر معمولی مفسر اِس مسئلہ فقہ سے واقف نہ ہوگا تو بہت ممکن ہے کہ وہ اٹھارہ ۱۸ یا نو ۹ بیویوں کو جائز قرار دے۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ علم تصوف جو معتبر اربابِ حق نے مرتب کیا ہے مفسر کے لیے اس سے واقفیت بھی بے حد ضروری ہے۔ قرآن عظیم میں بطور اشارات کچھ گہرے نکات بتائے گئے ہیں جو اربابِ حال اپنے احوال پر منطبق کرتے ہیں لیکن کوئی نکتہ ایسا نہیں ہے جس سے شریعت ظاہرہ کا قلع قمع ہو جائے لیکن فرقہ باطنیہ نے پورے قرآن کو ایسے نکات پر حمل کیا کہ جس سے شریعت کی پوری عمارت ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ حضرت امام غزالی ؒ نے ایسے گروہ کی سخت تردید کی ہے اور اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں مستقل بحث اس کے ابطال میں سپردِ قلم کی ہے۔

تنبیہ میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ کسی فرعی مسئلہ میں کسی کو اختلاف کا حق ہی نہیں بلکہ مدعا یہ ہے کہ بنیادی اصول اور مسلمہ ضوابط جن کے چھوڑ دینے سے اِسلام کی صورت ہی مسخ ہو جاتی ہے۔ وہ کسی مسلمان کو اختیار نہ کرنا چاہیے۔ ایسے اساسی قواعدِ قرآن واضح الدلالۃ عبارات سے ہی ثابت ہوتے ہیں۔ اگر قرآن عظیم کا وہ حصہ جو ائمہ دین میں یکساں مسلم ہے اور دورِ صحابہ سے اب تک اربابِ حق اسی راہ پر گامزن رہے ہیں، چھوڑ اگیا تو مذہب اِسلام ایک رسم و رواج کا ہی نام رہ جائے گا یا بوستانِ خیال قرار پائے گا۔

اسرائیلیات اور قرآن

تفسیر کا کثیر الوقوع اور رائج طریقہ یہ ہے کہ اسرائیلیات کی مدد سے قرآن کے مقاصد حل کیے جاتے ہیں اور اس کا اصل سبب یہ ہے کہ مشرکین مکہ اور مشرکین مدینہ علوم دینیہ سے غافل تھے۔ محض رسم و رواج اور آبائی تقلید پر اُن کے مذہب کا مدار تھا۔ اگر کسی چیز کی تحقیق علمی مقصود ہوتی تھی تو علماء بنی اسرائیل کی طرف رجوع کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کے پاس تورات اور انجیل تھی۔ اس لیے یہ اہلِ کتاب کہے جاتے تھے۔ تورات کے ماننے والے یہودی اور انجیل کے ماننے والے نصرانی باہم اچھا خاصا اختلاف رکھتے تھے۔ لیکن مشرکین دونوں کو ذی علم سمجھتے تھے اور وقتِ ضرورت دونوں کا دامن تھامتے تھے۔ بلکہ بعض لوگ سابقہ اور رائجہ مشرکانہ طریقہ کو چھوڑ کر یہودی یا نصرانی بن جاتے تھے۔ چنانچہ ورقہ بن نوفل، جو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے عزیز تھے، مشرکین کے طریقہ کو چھوڑ کر نصرانی ہو گئے تھے۔ اور وہ عبرانی زبان سے واقف تھے۔ موصوف نے ابتدائی وحی کے نازل ہوتے وقت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی تھی۔ عبداللہ بن سلام یہودی تھے، لیکن تورات کی پیشین گوئیاں جب غور سے سمجھیں تو وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر منطبق ہوئیں۔ اس لیے وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ علاوہ اِن حضرات کے دوسرے علماء اہلِ کتاب نے بھی سرورِ کائنات علیہ التحیہ والتسلیم کی تصدیق بھی اپنی کتابوں کی بنا پر کی تھی۔ الغرض اہلِ کتاب

میں حقانیت کے امکانات کافی تھے لیکن غلبۂ نفسانیت اور وساوسِ شیطانیہ یا ماحول کی خرابی نے اُن میں بھی مشرکانہ وکافرانہ طرق کو سرایت کرنے کا موقع پورے طور پر دے دیا تھا۔ چنانچہ یہودی عزیر علیہ السلام کو اور نصرانی عیسیٰ علیہ السلام کو خدائے تعالیٰ کا بیٹا کہا کرتے تھے۔ تاہم اُن کے پاس ایسا سامان ضرور تھا کہ اگر ٹھنڈے دل سے نفسانیت اور غلو عقیدت کو چھوڑ کر وہ غور کرتے تو سچی، صاف اور ستھری بات اُن کے سامنے آسکتی تھی۔ جس طرح بعض لوگ اس سے مستفید ہوئے۔ اسی بنا پر اللہ جل شانہ، وعم نوالہٗ نے قرآن عظیم میں فرمایا ہے۔

اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً	کیا ان کافروں کے لیے یہ علامت اور
اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا	نشانی نہیں کہ ان کو حضور علیہ السلام کو
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔	علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں۔

لیکن بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ آسمانی کتب کی خبروں کو چھپاتے تھے اور بعض مقامات پر تحریف کرتے تھے۔ قرآن عظیم میں متعدد مقامات پر اس کا تذکرہ ہے۔ چنانچہ ان میں ایک آیت یہ بھی ہے۔

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ	یہودی کلمات کو اپنے مقامات سے ہٹاتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے احوال مختلف تھے۔ بعض حقانیت پرست تھے اور اُن کی بات قابل اعتبار تھی۔ اور بعض باطل پرست تھے جن کی خبر کسی طرح قابلِ قبول نہ تھی۔ اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لَا تُصَدِّقُوْهُمْ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ	نہ اُن کی تصدیق کرو اور نہ اُن کی تکذیب

یہ حضورؐ کی بڑی کامل احتیاط ہے کہ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرماتے تھے کہ "اُن کی تصدیق نہ کرو" چوں کہ ممکن ہے کہ بات جھوٹی ہو۔ اور تم ان بنی اسرائیل کی وجہ سے غلطی میں مبتلا ہوجاؤ اور اسی طرح "تکذیب بھی نہ کرو" چوں کہ ممکن ہے

فی الواقع بات سچی ہو اور خواہ مخواہ اُس کو جھٹلا دو ۔ ہاں بنی اسرائیل میں سے ارباب علم جب اسلام میں داخل ہوگئے اور اُن کی بات قابلِ پذیرائی ہوگئی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔

حَدِّثُوا عَنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ — بنی اسرائیل سے واقعات نقل کرو

وَلَا حَرَجَ — اور اُس میں کوئی حرج نہیں ۔

اِن امور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علماء اہلِ اسلام کا فیصلہ یہ قرار پایا کہ پہلے قرآن وحدیث اور مسلّمہ کلیات واصول پر نظر کی جائے ۔ اس کے بعد اسرائیلیات پر نظر کی جائے ۔ اگر سابقہ یقینیات کے خلاف نہ ہوں تو مان لیا جائے ورنہ نظر انداز کر دینا ضروری ہے ۔

بعض تفاسیر میں لکھا ہے کہ " میدان تیہ میں جب پانی نہ تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نام حکم ہوا کہ وہ اپنا عصا پتھر پر ماریں ۔ چنانچہ حضرت کلیم اللہ علیہ السلام نے عصا کی ضرب لگائی اور اس سے بارہ چشمے برآمد ہوئے ۔ چوں کہ بنی اسرائیل کے بارہ خاندان تھے ۔ لہٰذا ہر خاندان کے لیے ایک چشمہ معیّن کر دیا گیا ۔ ہر چشمہ سے فائدہ حاصل کرنے والے لاکھوں انسان تھے "۔ اس واقعہ کو ابن خلدون نے اپنے مقدمہ تاریخ میں بری طرح جھٹلایا ہے اور کہا ہے کہ " حضرت یعقوب علیہ السلام جن کی اولاد کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زائد مقدّم نہ تھے ۔ چند پشتوں کا فاصلہ تھا ۔ ایسی حالت میں نسلِ اسرائیلی اس مقدار تک کسی طرح نہیں پہنچ سکتی " تو پھر مفسرین نے محض اسرائیلی قول کا کیوں اعتبار کیا اور عقلی اور قطعی چیز کو کیوں نظر انداز کیا ۔ ابن خلدون کا یہ قول قابلِ قبول ہے، اور مفسرین کی نیک گمانی کی بنا پر خالص بنی اسرائیل کی خبر پر اعتماد کر لینا قابلِ اعتبار نہیں

مسلمانوں میں تین قسم کے گروہ ہوئے ہیں ، اور یہی پورے عالم کا طریقہ ہے ، ایک گروہ ادنیٰ وہم پر واقعات کا انکار کر دیتا ہے ۔ اُن کو متشددین کہا جاتا ہے ۔

دوسرا گروہ متسہلین کا ہے۔ اُن کا حال یہ ہے کہ اوہام کے وجوہ اچھے خاصے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی اپنی نیک گمانی پر وہ واقعات کا اقرار و اظہار کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ یہ گروہ عند اللہ مقبول نہیں ہے بلکہ نیک گمانی کی غلو کی وجہ سے کواذب کو صوادق سمجھ جاتے ہیں۔ اس لیے بعض محدثین کرامؒ نے کہا ہے کہ "بعض بزرگانِ دین ایسے محترم ہیں کہ ہم اُن کی دُعا کے متمنی رہتے ہیں لیکن ان کی حیثیت لاشئے کے حکم میں ہے"۔

تیسرا گروہ معتدلین کا ہے۔ جن میں قبول اور عدمِ قبول کے معاملہ میں نہ غلو اور تشدد ہوتا ہے اور نہ مداہنت اور مساہلت۔ ایسے حضرات کا فیصلہ ہی قابلِ اعتبار ہے۔ اس لیے حضرات مفسرین ہیں جو اعتدال پسند، اور افراط و تفریط سے خالی ہوتے ہیں، ان کی تفسیر بمقابلہ متشددین و متسہلین کے قابلِ اعتبار ہوتی ہے۔

اسرائیلیات کی ایک بڑی کمزوری ہے قرآن عظیم کی تفسیر میں بعض مفسرین سے بھی ایک مقام پر لغزش ہوئی ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ

حضرت داؤد علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول ہیں، زبور اُن ہی پر نازل ہوئی۔ اُن ہی کے حق میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

وَكَانَ أَعْبَدَ الْبَشَرِ۔ انسانوں میں سب سے بڑے عابد تھے۔

نبی کی ذات خصوصًا بعد نبوت معاصی سے محفوظ و مامون ہوتی ہے۔ نفسانیت اُس کے قریب نہیں آتی۔ حقوق العباد اور حقوقِ الٰہی کا بدرجۂ اتم وہ اہتمام کرتا ہے، خودغرضی کو کبھی اپنا وتیرہ نہیں بناتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی نبی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اُس نے خواہشِ نفسانی کی وجہ سے اذیت پہنچائی، سخت بے ادبی اور انتہائی غلطی ہے۔ باوجود اس مسئلہ کے مسلم ہوتے ہوئے بعض مفسرین نے یہ لکھ دیا کہ حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ننانوے بیویاں تھیں اور ایک سپاہی کی بیوی حسینہ جمیلہ تھی۔ اُس کے قبضہ میں لانے کے لیے حضرت داؤد علیہ السلام نے اس فوجی سپاہی کو (جو اُمتی تھا) جنگ میں بھیجا کہ یہ

وہاں جاکر مارا جائے اور میں اس کی بیوی پر قبضہ کرلوں"۔ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا اور قرآن کی ایک آیت سے دھوکا ہوا۔ اسرائیلی تحقیق نے اُس کی تائید کردی۔ حالاں کہ شانِ داؤدی اس سے اعلیٰ وارفع تھی۔ ایک محترم نبی کی شان میں ایسا عقیدہ رکھنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ الغرض اسرائیلیات سے مَفر بھی نہیں، اور ہر چیز کو معتبر سمجھ لینا بھی درست نہیں۔ اِس امتیاز کے لیے استعدادِ علمی اور فراہمی معلوماتِ دینیہ کی بے حد ضرورت ہے۔

اس بیان سے واضح ہوگیا کہ ہر ذی علم کو یہ حق نہیں کہ وہ مفسّر بن سکے، بلکہ مہارت تامّہ اور علمِ کامل کے بغیر انسان کو خامہ فرسائی نہ کرنا چاہیے۔ اگر کچھ کہے یا لکھے تو اربابِ تحقیق کی تحقیق کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ یہ بھی ایک قسم کی تقلید ہے جس سے فی زمانہ کراہت پیدا ہوتی جاتی ہے اور یہی دین کی بربادی کر رہی ہے۔ علمی اور اخلاقی طور پر اس کا مفسدہ اس قدر نہیں جس قدر اعتقادی تباہی کا سبب ہے۔ اور دین میں اصل چیز عقیدہ ہے۔ بدعقیدگی کے ساتھ اگر اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ حمیدہ کا کوئی حامل ہو تو وہ دنیا میں فوائد حاصل کرسکتا ہے لیکن مقبولیت عند اللہ کسی عمل کی وجہ سے بغیر صحتِ عقیدہ کے ناممکن ہے۔ قرآن عظیم میں جابجا اعمال کی اصلاح کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعقیدہ بدعتی کے متعلق فرمایا ہے کہ "اُس کی نفلی اور فرضی عبادت مقبول نہیں۔ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنۡہُ

سائنس اور قرآن

انسان کی عملی زندگی دو بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہے۔ ایک عشق ومحبت۔ دوسری فلسفہ وحکمت۔ جو شخص اپنی زندگی محبت وعشق میں گزارنا چاہتا ہے وہ نہ کسی حجت ودلیل کی طرف دیکھتا ہے، نہ طنز وتشنیع سے متاثر ہوتا ہے اور نہ کسی کو الزام دے کر اپنے کو غالب اور دوسرے کو مغلوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ اپنے والہانہ جذبات کے دریا میں بہا چلا جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے حق میں قرآن عظیم کہتا ہے۔

وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔	وہ لوگ کسی ملامت گر کی ملامت سے خوف زدہ نہیں ہوتے۔

زندگی کا یہ سانچہ بہت مفید اور نتیجہ خیز خطرات سے پاک وسواسِ شیطانیہ سے محفوظ ہے۔ اور خاصانِ خدا نے جو مراتبِ عالیہ حاصل کیے ہیں وہ اسی کے ذریعہ حاصل کیے ہیں۔ لیکن کبھی یہ محبّت حد سے زیادہ تجاوز کر جاتی ہے۔ یا بے سمجھے بوجھے ہوتی ہے تو اس کی انتہا شرک وکفر پر ہوتی ہے۔ العیاذ باللہ۔

اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ دانائی اور حکمت سے بھی کام لے اور شمعِ عرفان کے ساتھ چراغِ علم کو بھی روشن رکھے۔ ایسے لوگوں کے حق میں قرآن کہتا ہے

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا	جس کو حکمت دے دی گئی اسے خیر کثیر جس دی گئی۔

صحیح علم کو حکمت و فلسفہ کہتے ہیں۔ لیکن یہ امتیاز کہ یہ علم صحیح ہے یا نہیں، اس کے جانچنے کے لیے منطقیات کا علم ایجاد کیا گیا ہے۔ اس فن سے بہت سے مقامات پر رہنمائی بھی ہوتی ہے۔ لیکن بعض مقامات پر آدمی ایسی ٹھوکر کھاتا ہے کہ پھر سنبھل نہیں سکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت نے آسمانی کتب اور اقوالِ انبیاء علیہم السلام سے انسان کو غلط روی اور کج رہی سے روکا۔ امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے قرآن عظیم نازل ہوا جو بحمد اللہ آج تک محفوظ ہے۔ قرآن کے مطالب واضح کرنے کے لیے فنِ تفسیر ہے جس میں سراسر حکمت ہے۔ لیکن حکیمانہ اصول و فروع کو سمجھنے کے لیے ذی علم انسان رائج حکمت و فلسفہ سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی کوشش کرتا ہے کہ قرآن اور رائج فلسفہ کو مطابق کرے۔ نزولِ قرآن کے وقت ارسطونی فلسفہ، بطلیموسی حکمت رائج تھی، جو صدیوں تک رہی۔ اور اب تک قدیمی نصابوں میں اُن ہی اصول کی کتابیں داخل درس ہیں۔ اس لیے علماء کے دماغ میں زائد وہی امور ہیں جن کا تعلق ارسطاطالیس وغیرہ کے فلسفہ سے ہے۔ یورپ اور اس کے طریقہ پر چلنے والوں میں یہ فلسفہ دفتر پارینہ ہے اور جدید فلسفی اصول قابلِ قبول ہیں۔ جدید طریقہ تعلیم میں سائنس کی تحقیق کے مطابق واقعات کو سمجھنا ہی حکمت و دانائی ہے۔ موجودہ فلسفہ میں خواہ کسی قدر اضافہ ہوا ہو لیکن بنیاد وہی یونانی اصول ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ فلاسفہ و حکماء نے کچھ صحیح سمجھا ہی نہیں۔ ہاں یوں ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہر چیز نے صحیح راہ اختیار نہیں کی۔ یہی وہ بات ہے جس کو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ایسے مقامات پر قرآن ہی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے لیکن قرآن نے یہ کہیں نہیں کہا ہے کہ "میں بلا ضرورت بھی ہر چیز کا مفصل حال بیان کروں گا"۔ اس لیے مسلمان کا منصب ہے کہ واضح اُصول کو قرآن سے اخذ کرنے کے بعد عقلیات اور تجربیات انہیں اُصول کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرے۔ جو قرآن کے مطابق ہو مان لے۔ اور جو مخالف ہو رد کر دے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ "فلاسفہ قدماء تو آسمانوں کے قائل تھے اور وہ یہ بھی کہتے

تھے کہ نواں فلک جو سب افلاک پر محیط ہے، ستاروں سے بالکل خالی ہے۔ اس سے نیچے جو آٹھواں آسمان ہے وہ ستارہائے ثوابت سے پُر ہے۔ آٹھویں کے نیچے سات آسمان ہیں جن میں ایک ایک سیارہ ہے۔ اُس کی ترتیب فوقانی سے تحتانی تک یوں ہے"۔

زحل، مشتری ست و مریخ وشمس پنجم زہرہ، عطارد و قمر

اس کے ساتھ ساتھ وہ حکما، اس کے بھی قائل تھے کہ جملہ افلاک پیاز کے چھلکوں کی طرح آپس میں چپٹے ہوئے ہیں۔ درمیان میں فاصلہ نہیں۔ بعض مسلمان مفسروں نے ان رائجہ اصول کو مدّ نظر رکھتے ہوئے قرآن اور علم ہیت کو اس طرح منطبق کیا کہ "آٹھواں فلک کرسی ہے اور نواں فلک عرش"۔ اس تدبیر سے عدد تو پورا ہو گیا۔ لیکن شریعت میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ" آسمانوں کے درمیان فاصلہ ہے اور اس میں مخلوق آباد ہے"۔ اس طرح فلسفۂ قدیم اور قرآن کریم یکساں نہ ہو سکا۔ نیز عرش کی ہیت جو احادیث سے ثابت ہے وہ اور ہے اور فلسفہ میں دوسری۔ اس لیے تفسیر میں اس کی کوشش بے سود ہے نیز قرآن کریم میں سیارات اور ثوابت کا محل نہیں بتایا گیا ہے۔ صرف اس قدر ظاہر کیا گیا کہ پہلے آسمان کی زینت ستاروں سے ہے۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ۔ ہم نے قریب والے سمار کو چراغوں سے مزین کیا۔

زینت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ چراغ آسمان میں جڑا ہوا ہو۔ شامیانے کے نیچے جو قمقمے لٹکے ہوتے ہیں، شامیانے کی زینت ہوتے ہیں۔ قرآن عظیم میں لفظ اسمار استعمال کیا جاتا ہے اور سما عربی زبان میں ہر اس شے کو کہتے ہیں جو سایہ افگن ہو۔ اس کے کے لحاظ سے بادل و بارش سب کو سما کہا جا سکتا ہے اور وہ خلا جو بادل سے فوق ہے، اُس کو بھی سمار کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے جدید تحقیق کے مطابق اگر یہ کہا جائے کہ ستارے خلا میں ہیں کسی آسمان میں جڑے ہوئے نہیں ہیں تو قرآن اس کے خلاف نہیں۔

— قاضی ابو بکر بن العربی نے یہ ہی کہا ہے۔

قرآن شریف میں ہے

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ہر ایک ستارہ فلک میں تیرتا ہے۔

لفظ "فلک" سے بظاہر مراد وہ مدار ہے جس پر ستارہ حرکت کرتا ہے۔ اس سے کسی کا آسمان میں جڑا ہوا ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے بلکہ ستاروں کی گردش کا ثبوت ملتا ہے

———— اس قسم کی تقریر یا تحریر سے کبھی یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید آسمانوں کا وجود ہی نہیں۔ جس طرح موجودہ دور کے سائنس دانوں کا خیال ہے۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ خلا میں ستاروں کا ہونا اور اپنے مدار پر گردش کرنا اس کی نفی نہیں کرتا کہ سات افلاک ہیں جس کا اسلام قائل ہے اور اس میں ملائک آباد ہیں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں معراج جسمانی سے پہنچے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان افلاک کا مقام اس خلا اور اس فضا سے بالاتر ہے۔ اس چیز کی صراحت قاضی ابوبکر نے کی ہے زمین کے سکون یا حرکت کا مسئلہ بھی اس دور میں معرکۃ الآرا ہے۔ موجودہ تحقیق یہ ہے کہ "زمین متحرک ہے"۔ سابقین کا یہ فلسفہ تھا کہ "زمین ساکن ہے"۔ سکون ارض کو تسلیم کرتے ہوئے نثر و نظم میں خامہ فرسائی کی جاتی تھی۔ چنانچہ مشہور شعر ہے ؎

زمین در حبِ او ساکن فلک در عشقِ او شیدا وصلّی اللہ علیٰ نور کزو شد نورہا پیدا

بعض مفسرین بھی اس مسئلہ سے متاثر ہوئے اور قرآن کی آیتوں سے سکونِ ارض ثابت کرنے کے لیے کوشاں ہوئے۔ حالاں کہ قرآن میں کسی مقام پر صحیح طور سے نہ زمین کا سکون بیان کیا گیا اور نہ متحرک ہونا۔ اس لیے دونوں احتمال یکساں ہیں۔

یہ بات پہلے ثابت ہو چکی ہے کہ قرآن پاک تہذیبِ اخلاق اور اصلاحِ اعمال کے لیے جن چیزوں کو ضروری سمجھتا ہے۔ ان کو بیان کرتا ہے۔ اور اس مدعا میں جو شے ضروری نہ ہو اس کو اربابِ علم کی تحقیق پر چھوڑتا ہے۔ البتہ اسلام ان دو باتوں کی رہنمائی کرتا ہے

ایک یہ کہ غیر ضروری اور غیر مفید چیزمیں بیکار وقت ضائع نہ کیا جائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے

مِنْ حُسنِ اِسْلامِ الْمرءِ تَرْكُ مَا لَا يَعْنِيه — آدمی کے حسنِ اسلام کا تقاضا ہے کہ لایعنی چیزوں کو ترک کردے۔

دوسری بات اسلام میں یہ ضروری ہے کہ علمی تحقیقات کو قطعی اور یقینی عقائد پر ترجیح نہ دی جائے طریقۂ سلامتی یہ ہے کہ جہاں عقل پورا فیصلہ نہ کرسکے اور پورا علم نہ ہو سکے، وہاں خاموشی اختیار کرکے یہ کہہ دے کہ "اللہ جانے"۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے۔

مِنَ الْعِلْمِ اَنْ تَقُوْلَ لِمَا لَا تَعْلَم "اللّٰہُ اَعْلَم"۔ — یہ علم کی بات ہے جو نہ جانتا ہو اس کے متعلق یہ کہدے کہ "واللہ اعلم"

بڑے بڑے اکابرِ اسلام نے اسی حدیث پر نظر کرتے ہوئے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا ہے۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ سے سوال کیا گیا کہ "دہر کیا چیز ہے؟" آپ نے جواب میں فرمایا کہ "لا اَدرِی" "میں نہیں جانتا"۔ حضرت امام مالکؒ سے چالیس مسئلے دریافت کیے گئے۔ ۴ کا جواب دیا اور ۳۶ میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہ حضرات اپنے زمانے میں دین کے ایسے چراغ تھے جن کی روشنی اب تک باقی ہے۔ کیا ایسے حالات میں اِس وقت کے کم مایہ مسلمان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہر چیز کے فیصلے کے لیے تیار ہو اور بعض اوقات قطعی اور یقینی امور کا اس لیے انکار کردے کہ ماحول اور وقت اُس کے خلاف ہے سہ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ

الغرض مدعا یہ ہے کہ عوام تو سنی سُنائی باتوں کے لیے ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے فلسفی تحقیقات پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مسلمان کو غور کرنا چاہیے۔ فلسفۂ قدیم ہو یا جدید ہمارے یقینی مسائل کی کس قدر موافقت کرتا ہے اور کہاں کہاں مخالفت۔ موافق ہونے کی صورت میں تو "چشم ما روشن و دل ما شاد"۔ مخالفت کی صورت میں یہ کہنا ضروری ہے کہ انسانی علم بہت محدود ہے اور عقل کو ہر مقام پر دوڑانا عاقل کا کام نہیں۔

نہ بہر جائے مرکب تواں تاختن کہ جاہا سپر باید انداختن

فلسفہ قدیم جس پر نازاں تھا آج اُس کی مٹی ایسی پلید ہے کہ اسکولوں کے بچے بھی اس پر قہقہہ بازی کرتے ہیں۔ نیز جس دور میں اس فلسفہ کا دور تھا آرار مختلف تھیں اور ایک فلسفی دوسرے فلسفی کی بالاعلان تردید کرتا تھا۔ کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ فلاسفہ کے درمیان ہی اختلاف محدود نہیں، ائمہ اسلام کے درمیان میں بھی ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ لہٰذا دین بھی ماننے کے قابل نہیں رہا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اکابرِ دین جو اربابِ حق ہیں اور اہل سنّت نے ان کی حقانیت تسلیم کی ہے۔ کسی یقینی مسئلہ میں مختلف الرائے نہیں۔ البتہ فرعی اور ظنی مسائل میں ضرور اختلاف ہے۔ جس سے اِسلام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کا حال یہ ہے کہ طبیب اپنے اصول کے تحت امراض اور مریضوں کے لیے تشخیص اور تجویز کرتے ہیں اور اس تشخیص و تجویز میں باہم اختلاف بھی ہوتا ہے۔ لیکن قطعی اور یقینی امور میں اتحاد رہتا ہے۔ اطباء معالجِ جسمانی اور مادّی ہیں۔ ائمہ معالجِ روحانی وایمانی ہیں۔

غلو اور میانہ روی

متقدمین میں ذوقِ طبع اور مناسبت علمی کا تفاوت تھا اور یہ ایک فطری چیز ہے جو ناگزیر ہے۔ بعض اربابِ علم ظاہری شریعت اور اتباع سنّت کو اپنا نصب العین قرار دیئے ہوئے تھے اور اُن کی نظر میں عشق و محبّت اور والہانہ جذبات سے ہٹی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ تفاسیر میں اسی معیار کو پیش نظر رکھتے تھے۔ نفس تراجم اور اس سے نکالے ہوئے فوائد و نتائج کی عمارت اسی بنیاد پر تعمیر کرتے تھے۔ اس میں کچھ حرج تو نہ تھا۔ لیکن یہ چیز کبھی حدِ غلو تک پہنچ جاتی تھی اور اس کا مبالغہ اصلیت پر ایسا پردہ ڈال دیتا تھا کہ حقانیت اس میں چھپ کر رہ جاتی تھی۔ عربی کی کہاوت ہے۔ اِذَا جَاوَزَ الشَّیءُ حَدَّہٗ یُشَابِہُ ضِدَّہٗ۔ چیز جب حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو اپنی ضد سے مشابہ ہو جاتی ہے۔ پانی جب شفاف اور صاف ہوتا ہے تو نیل گوں معلوم ہوتا ہے۔ درختوں کے پتّوں کی سبزی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو پتّے سیاہ معلوم ہوتے ہیں۔ شیرنی اگر کسی چیز بڑھ جاتی ہے تو وہ چیز تلخی کے قریب آجاتی ہے۔ اسی طرح جب کسی پر عشق و محبّت کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ اتباع قانون میں اس قدر کمزور ہو جاتا ہے کہ گویا قانونِ اسلام اُس کے لیے آیا ہی نہیں بلکہ یہ چیز جب جُہّال تک پہنچتی ہے تو وہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ کاملِ عشق قانونی جکڑبندیوں سے سبک دوش کر دیتا ہے اور یہ ایک قسم کا الحاد ہے۔ (العیاذ باللہ) اُس

کے مقابل اتباعِ قانون میں جب مبالغہ ہو جاتا ہے تو مبلغینِ قانون یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ "محبت محض اتباع کا نام ہے" یہ بھی غلطی ہے۔

واقعہ اس کے خلاف ہے" محبّت امر قلبی ہے اور اتباع ہاتھ پاؤں کا کام ہے" مفسرین میں جو اتباعِ سنت کو ساتھ لے کر چلتے ہیں، وہ حق پرست ہیں اور اس اعتدالی حق پرستی سے افراط و تفریط سے سبکدوش رہتے ہیں اور میانہ روی کی راہ اختیار کر کے اِسلامی اعتدال کے حامل ہوتے ہیں اور امّت وسط ہونے کا فخر انھیں حاصل ہوتا ہے۔

ہندوستان میں تفاسیر و تراجم کی خدمات کا کام دیوبندی مکتبہ فکر کے علماء نے بہت کیا ہے جن کے یہاں اتباعِ سنّت کا اہتمام زائد ہے اور محبت کا پہلو مغلوب۔

بریلوی مکتبہ خیال کے علماء نے محبّت کے پہلو کو غالب رکھا ہے۔

مودودی اور اہل حدیث نے درجۂ اجتہاد میں اپنے کو داخل سمجھ کر مجتہدانہ انداز میں کلام کیا ہے ہم مجتہدانہ انداز سے بہت دور ہیں۔ اس لیے کہ اپنے کو ناقص العقل، قلیل العلم اور حقیر الاستعداد تصور کرتے ہیں۔ محبت میں ہم قادری ہیں اور قانون میں حنفی۔ اس لیے علماءِ احناف اور حضراتِ صوفیہ دونوں کا وقار پیشِ نظر رکھنا ہمارا ضروری شیوہ اور لازمی وتیرہ ہے۔ ہم اردو تفاسیر میں تفسیرِ حقانی کو عمدہ تفسیر سمجھتے ہیں۔ اور اگر خدا تعالیٰ نے توفیق دی کہ ہم بھی قرآن کی تفسیر کریں تو اِن شاءَ اللہ ان تمام مبینہ چیزوں کا اہتمام کریں گے۔

اصولِ تفسیر میں علماءِ عظام نے بہت ہی مطول اور مفصل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان ہی میں سے علامہ سیوطیؒ کی تصنیف "الاتقان فی علوم القرآن" بہت ہی مفصل، مطول اور بہترین کتاب ہے۔ اردو میں شیخ احمد عبدالحق مفسرِ "حقانی" کا مقدمہ تفسیر بھی بہت دراز ہے اسی طرح "الفوز الکبیر" [شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی] اگرچہ مختصر ہے لیکن ہمارے بیان کردہ اصول کے مقابلہ میں وہ بھی طویل ہے۔ اگر ان چیزوں کو ہم بھی بیان کرتے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی اس لیے اب ہم قرآن کریم کے نزول کی ترتیب کے متعلق کچھ کہیں گے۔

5070

ترتیبِ نزولی

قرآن کریم کا نزول چوں کہ اصلاحِ قوم اور رہنمائی عالم کے لیے ہوا ہے۔ اِس لیے مصالحِ اسلام پر نظر رکھنا ضروری تھا۔ اللہ جلّ شانہٗ وعمّ نوالہٗ پہلے مسئلہ مبداء [خدا] اور مسئلہ معاد [آخرت] کے لیے دلائل بیان کیے اور پیرایۂ بیان زیادہ دل کش اختیار کیا۔ جس میں مسجع عبارت کا اہتمام کیا گیا۔ جس کو قرآن مجید کے آخری حصہ کی تلاوت سے آپ خود محسوس کریں گے۔

قوم کی اصلاح سے پہلے یہ بھی ضروری تھا کہ اپنے رسول علیہ الصلوۃ والسلام کو طریقۂ زندگی کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ دوسروں کے لیے صحیح رہ نما ہو سکیں۔ ھادی اور رہبر اگر خود صحیح راہ پر نہ چلے تو اس کا قول دوسروں کے حق میں موثر نہیں ہوتا۔ اِس دور میں تبلیغِ دین اور اشاعتِ حق اس لیے بھی ناکامی سے دوچار ہو رہی ہے کہ مبلغ خود پابندِ حق نہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر غارِ حرا میں پہلی وحی یہ نازل ہوئی۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ	اے نبیؐ! اپنے پروردگار کا نام لیجیے جس نے عالم کی تخلیق کی۔ انسان کو خونِ بستہ سے پیدا کیا۔ پڑھیے! اور آپ کا رب بہت

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

عزت والا ہے۔ اسی نے خط و کتابت سکھائی اور انسانوں کو ان چیزوں سے واقف کیا جس سے وہ ناواقف تھا۔

آخری آیت جس کے بعد بظاہر نزولِ قرآن کا دروازہ بند ہو گیا، یہ ہے:

وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ

اس دن سے ڈرو جس دن تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور نفس کو اس کے پورے پورے عمل کا بدلہ دیا جائے گا۔ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

پہلی آیت مبارکہ میں مبداءِ عالم یعنی: خدائے قدوس کی ذات اور صفات کا ذکر ہے اور آخری آیت میں معاد اور آخرت کا بیان ہے اور انہیں دو عقیدوں پر اسلام کی بنیاد تعمیر کی گئی ہے۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی وحی سورۂ مدثر ہے اور یہ بھی صحیح ہے یعنی نزولِ احکام کی بنا یہی سورۃ ہے۔ سورۂ اقراء میں محض عقائد کا بیان تھا، احکام کا تذکرہ نہ تھا۔ اسی طرح بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخری آیت یہ ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

آج تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔ اور نعمتوں کی تمہارے لیے تکمیل کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔

یہ بات بھی غلط نہیں ہے۔ چوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ احکامِ عملیہ کی تکمیل کر دی۔ اب دوسرے احکام کا اضافہ نہ ہو گا۔

بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے وحی یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْ اَوْلَادِکُمْ ہے۔ درحقیقت یہ پورا رکوع ہے جو مسائلِ وراثت کے لیے پہلے نازل ہوا ہے

اور وراثت کے لیے آخری آیت یَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ ہے۔ جو دوسرے مقام پر مذکور رہے۔ اس مضمون کی تفصیل طریقہ بالا کے مطابق نہ کی جائے تو تعارض اور اس سے اشتباہات کی بڑی سخت الجھن پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے جو عوام کے لیے نہیں بلکہ خواص کے لیے بھی مسئلہ لاینحل بن سکتا ہے۔ اس قسم کے اشتباہات بہت سے مقامات پر پیدا ہو جاتے ہیں اور بعض ضعیف العقیدہ افراد کو مرتد ہونے کی حد تک پہنچا دیتے ہیں [العیاذ باللہ] اس لیے علم تاریخ الاسلام بہت اہم ہے۔ یہ اشتباہات دوسری آیات مبارکہ میں بھی پیدا ہوتے ہیں

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ ترتیبِ نزولی جدا ہے اور ترتیبِ تلاوت جدا۔

ترتیبِ نزولی میں پہلا رتبہ سورہ اقراء کا ہے۔ ان آیات میں حضور نبی اکرمؐ کو مخصوص عقائد کی تعلیم تو ضرور دی گئی ہے لیکن تبلیغ احکام کا کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ یعنی نبیؐ کو وحی کے ذریعہ خبردار بنایا گیا ہے لیکن پیام رساں رسول نہیں بنایا گیا۔ رسالت اور پیامبری کا رتبہ سورہ مدثر سے شروع ہوتا ہے۔

یہاں سے ایک نکتہ حل ہو گیا کہ نبی اور رسول میں یہی فرق ہے کہ نبی اس شخص کو کہتے ہیں جس پر وحی کا نزول ہو خواہ وہ پیغام رسانی کے ساتھ مکلّف ہو یا نہ ہو اور رسول وہ ہے جو احکام کے پہنچانے کا ذمہ دار بنایا گیا ہو۔ یہ اصطلاح علامہ جلال الدین سیوطی اور جلال الدین محلیؒ نے اختیار کی ہے اور یہی معتبر معلوم ہوتی ہے۔ اصطلاح دوسری بھی ہے لیکن عام طور پر قرآن کی رفتار اسی اصطلاح کو سمجھاتی ہے۔ [واللہ اعلم]

نزولِ قرآن کی ابتدا اس وقت ہوئی کہ سرورِ کائنات کی عمر چالیس سال تھی۔ ابتدائی قرآن نازل ہونے کے بعد وحی کی آمد میں وقفہ ہو گیا۔ جس کو اصطلاحاً "فترۃ الوحی" کہتے ہیں۔ اس کی مدت تین سال رہی۔ اس مدت میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے بیحد طالب اور مشتاق رہے۔ غالبًا باری تعالیٰ کی یہ مصلحت تھی کہ آتشِ طلب

میں زیادہ اشتعال پیدا ہوتا کہ دوبارہ سلسلہ وحی کے شروع ہونے پر اس کا وقار اور قدر ومنزلت کافی وافی ہو۔ عربی کی کہاوت ہے۔ الحَاصِلُ بَعْدَ الطَّلَبِ اَعَزُّ مِنَ المیثاق تبعہ جو شے طلب کے بعد حاصل ہوتی ہے وہ زائد عزیز ہوتی ہے اس شے کے مقابلہ میں جو بلا تکلیف حاصل ہوتی ہے۔ فترۃ الوحی کے بعد نزولِ وحی کا سلسلہ رہا اس کے بعد جو وقفے ہوئے وہ مختصر تھے۔ حضور کی عمر مبارک تریسٹھ ۶۳ سال ہوئی۔ اس کے حساب سے تیئیس ۲۳ سال تک وحی کا سلسلہ رہا۔ اگر پہلے وقفہ کے تین ۳ سال مستثنیٰ کر دیے جائیں تو نزولِ قرآن کی مدت بیس ۲۰ سال رہتی ہے۔ اس بیان سے ایک تعارض رفع ہو گیا وہ یہ کہ بعض اربابِ علم نزولِ قرآن کی مدت ۲۰ سال بیان کرتے ہیں اور بعض تیئیس ۲۳ سال۔ دونوں باتیں اپنے اپنے مقام پر درست ہیں۔ جس نے وقفۂ دراز کا اعتبار کیا اس نے ۲۰ سال کہے اور جس نے دراز وقفہ کو مختصر وقفوں کے ساتھ ملا دیا اس نے تیئیس ۲۳ سال مدت قرار دی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوتِ تحمل کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وقت نزولِ وحی چوں کہ عالم ملوک سے تعلق ہوتا تھا اور صفات جبروت کی تجلیاں ذاتِ گرامی پر وارد ہوتی تھیں۔ سخت سردی کے زمانے میں پسینہ آجاتا تھا اور پیشانیٔ مبارک سے قطرات کا ٹپکنا شروع ہو جاتا تھا۔ سلسلہ نزول کے ختم ہونے پر وہ وحی امت کو پہنچاتے تھے اور لکھواتے تھے نیز فرماتے تھے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں درج کیا جائے اور ان آیات کو فلاں میں۔

وقتِ نزولِ وحی سخت تاثر ہوتا تھا۔ قوی احادیث میں آیا ہے کہ ایک موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے صحابی زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ران پر سرِ مبارک رکھے ہوئے تھے۔ اچانک زید بن ثابت کو یہ خطرہ ہوا کہ ان کی ران کی ہڈی کہیں چور چور نہ ہو جائے۔ تکلیف کا تقاضا تھا کہ اپنی ران علیحدہ کر لیں لیکن حضور کے جاگنے کے اندیشے سے تحمل کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جب بیدار ہوئے تو زید بن ثابتؓ کی حالت کا اندازہ

فرمایا۔ زیدؓ نے خود بھی دریافت کیا کہ "حضورؐ! کیا ماجرا تھا؟" فرمایا "ہم پر اس وقت وحی نازل ہوئی تھی"۔ زیدؓ نے سوال کیا "حضور! کیا وحی نازل ہوئی"۔ فرمایا۔ "غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ الفاظ کا اس وقت نزول ہوا"۔

مقامِ غور وفکر ہے وحی کا نزول اور قرآن عظیم کے مختصر حصّے کا ورود حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا تھا جس کا تعلق حضور کے دل و دماغ اور روحِ پاک سے تھا۔ حضرت زیدؓ پر وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ ان کا بدن مبارک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمِ مبارک کے ساتھ متصل تھا۔ اس اتصال کا اثر یہ تھا کہ ہڈیاں چور ہوئی جاتی تھیں۔ پھر حاملِ وحی اور مہبطِ قرآن کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ لیکن اللہ جل شانہٗ نے نبوت و رسالت کے لیے اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو منتخب فرمایا تھا اور اسی کے مطابق عالی ظرفی، قوتِ برداشت اور طاقتِ تحمّل بھی عطا کیا تھا۔

بعض سادہ لوح یہ خیال کرتے ہیں کہ نبی بھی ایک انسان ہوتا ہے۔ جیسے ہمارا کھانا سونا، جاگنا، ماں باپ سے پیدا ہونا، شادی کرنا اور اولاد کی تربیت کرنا جملہ انسانوں میں یکساں ہیں اسی طرح نبی کی بھی حالت ہے۔ اس تخیلِ فاسد کا جواب واضح ہے۔ اوّل تو یہ کہنا کہ امور مذکورہ میں جملہ انسان یکساں ہیں، غلط ہے۔ ایک انسان ایک بچّے کی پرورش بھی نہیں کرسکتا اور دوسرا شخص آٹھ، دس اولادوں کو تربیت دیتا ہے۔ ایک آدمی نانِ شبینہ کا محتاج ہوتا ہے اور دوسرا شخص حسنِ تدبیر سے لاکھوں روپے کی دولت کماتا ہے۔ علاوہ اس کے نبی کی شان اونچے سے اونچے انسان سے بھی زیادہ بلند ہوتی ہے صحابی رسول جس کو درجۂ ولایت حاصل ہے، وہ بھی اس بوجھ کا تحمّل نہیں کرسکتا۔ لیکن نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام روزانہ اُٹھاتے تھے۔ یہ مضمون قرآن کی اِس آیت میں مذکور ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ	آپ کہہ دیجیے میں تمہاری طرح آدمی ہوں
إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ	لیکن مجھ پر وحی کا نزول ہوتا ہے جو کمالات

وَاحِدٌ کی بنیاد ہے۔

حضورؐ کی شان اعجاز بہت بلند و بالا ہے۔ زندگی میں بہت سے معجزات کا آپ کی ذاتِ پاک سے ظہور رہوا۔ لیکن اگر تمام معجزات سے قطع نظر کی جائے تو محض نزولِ قرآن کا تحمل خود ایک معجزہ ہے جس طرح قرآن خود ایک شان اور معجزہ ہے۔

منکرینِ معجزات آنکھیں کھولیں اور دل سے غور کریں کہ انکارِ معجزات کیسی صریح غلطی ہے اور کیسی فاحش دیدہ دیری ہے جو عاقل کے لیے کسی طرح زیبا نہیں۔ جاہل اگر ایسی بات کہتا تو اس کے لیے کچھ عذر کا موقع ہوتا بھی۔ لیکن تعجب ہے کہ انکارِ معجزات ہمیشہ لکھے پڑھے اربابِ علم سے ظہور میں آتا ہے۔ جہّال انکار نہیں کرتے۔ مدعیانِ عقل تو اپنے عاقلانہ کمال پر نازاں ہوئے اور معجزات کو اتفاقات سمجھ کر مطلق معجزہ کے منکر ہوئے۔ جاہل ناواقف اپنی خوش عقیدگی میں مارے گئے۔ یعنی انھوں نے بوڑھی مستورات کے افسانہ جات کو سچا مان کر ہر جھوٹے افسانہ کو معجزہ کہنا شروع کر دیا اور اس کی کوشش نہیں کی کہ اس واقعہ کی کوئی اصل کسی معتبر عالم نے بیان کی ہے یا نہیں۔ اس سے اغلاط کا انبار ہو گیا اور صاف ستھری معتبر بات کا فقدان۔

ترتیبِ تلاوت

قرآن عظیم اللہ جل شانہ، کی ایک صفت قدیمہ ہے جو اس کی ذات عالی میں ہمیشہ سے موجود ہے۔ جس کی نہ ابتداء ہے اور نہ انتہا۔ جس طرح ذات باری تعالیٰ ازلی [لاابتدائ] اور ابدی [لاانتہاء] ہے۔ اسی طرح اس کی صفات بھی اس کے ساتھ ساتھ ہیں۔ خدائے برتر جلّ جلالہ، کی ذات وصفات مخلوق نہیں۔ مخلوق ہونے کے لیے ایجاد اور انفصال کی ضرورت ہے۔ خدائے قدوس کی کوئی صفت اس سے جدا نہیں۔ اسی طرح کلام جو اُس کی ذات میں داخل ہے وہ بھی اس سے جدا نہیں۔ اس کو ...... اہلِ سنت کلام نفسی کہتے ہیں۔ اس میں تلفظ اور تکلّم کو دخل نہیں ہوتا اور کلام کہا جاتا ہے۔ ظاہری نظر میں انسان کو دھوکہ ہوتا ہے کہ کلام کے لیے تلفظ اور تکلّم لازمی ہے۔ لیکن معمولی فکر سے اس دھوکے کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ اردو زبان میں کلام کا ترجمہ کبھی "بات" کیا جاتا ہے۔ بات زبان سے کی جاتی ہے لیکن کبھی دل میں سوچی بھی جاتی ہے۔

بس یہ کلام قدیمی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ مخلوق نہیں۔ اس لیے جو لوگ کلامِ خداوندی کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں، وہ زمرہ اہلِ سنت سے خارج ہیں۔ اور خلافت عباسی میں یہ مسئلہ بہت معرکۃ الآرا رہا ہے۔ بڑے بڑے اکابرینِ اسلام

کو سخت اذیتیں پہنچائی گئیں۔ اس صفتِ خداوندی کا پہلا ظہور لوح محفوظ میں ہوا، اور جبریل امین علیہ السلام کی ذات گرامی میں لوحِ محفوظ میں جو اس قرآن عظیم کی ترتیب تھی، وہی ترتیب تلاوت کی ہے۔ اسی مخصوص ترتیب کے ساتھ پہلے آسمان پر اُتارا گیا اور مقام "بیت العزۃ" پر محفوظ کر لیا گیا۔ وہاں سے حسبِ ضرورت اور مطابقِ مصالح تھوڑا تھوڑا مختلف مقامات سے نازل ہوتا رہا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کاتبین وحی کو تلقین فرماتے رہے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں اور دوسری آیات کو فلاں سورت میں لکھتے رہو۔ اس زمانہ میں موجودہ دور کا کاغذ نہ تھا۔ کتابت کھجور کی ٹہنیوں پر، پتھروں کے ٹکڑوں اور جھلیوں پر کی جاتی تھی، وہی ہوتی رہی۔ یہ پورا کلام بیت المال میں محفوظ رہا۔ گویا مال اور علمی خزانہ ایک ہی مکان میں محفوظ تھا۔ علمی سرمایہ مالی سرمایہ کے مقابلہ میں بہت زائد گراں قدر ہے اور خصوصیت سے قرآن کا سرمایہ عالم کے تمام سرمایہ جات کے مقابلہ میں گراں قدر اور بیش بہا ہے۔ حضور کے مُبارک دور میں ہر چیز مختصر اور قلیل تھی اس لیے کتابت قرآن کریم کا سامان بھی کم تھا۔ علاوہ بیت المال والے قرآن کریم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پاس بھی لکھا ہوا موجود تھا۔ اِس کتابت کے ساتھ ساتھ حفظِ قرآن کا ایسا ذوق تھا کہ سینکڑوں حفاظ موجود تھے۔ حضورؐ کی حیات طیبہ کے پورے دور میں قرآن عظیم کا یہی حال رہا۔ حضورؐ کی رحلت کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب مسیلمہ کذّاب کے مقابلہ میں لشکر روانہ کیا اور بفضلہ تعالیٰ وہ لشکر کامیاب ہوا۔ جھوٹا نبی مسیلمہ مارا گیا۔ لیکن مسلمان بھی بکثرت شہید ہوئے جن میں سات سَو حفاظ قرآن تھے۔ اس واقعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت عمر ابن الخطابؓ بہت گھبرائے اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ قرآن کے معاملہ میں جلدی کیجیے۔ اگر حفاظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو قرآن ضائع ہو جائے گا۔ بیت المال میں جو منتشر طور پر موجود ہے اس کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے

فرمایا۔ میں وہ کام کیسے کروں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا" یہ کام ضروری اور خیر کا ہے؛ اس میں مضائقہ نہیں"۔ آخر میں حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کرلیا اور حضرت زید بن ثابت کو طلب کیا۔ اُن سے خلیفہ اوّل رضؓ نے فرمایا۔" دورِ رسالت میں آپؓ نے وحی کی کتابت کا کام کیا ہے۔ آپؓ سچے اور امانت دار مسلمان ہیں۔ اس لیے اِس خدمت کی ذمہ داری آپ لیں"۔ زید بن ثابت نے اوّل اوّل اس خدمت کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اس کی وجہ وہی تھی جو خلیفہ اوّل کے دل میں آئی تھی۔ لیکن بحث وتمحیص کے بعد وہ بھی اس رائے سے متفق ہوگئے اور کام شروع کردیا اور بفضلہ تعالیٰ قرآن دو پٹھوں کے درمیان آگیا اور ضائع ہونے کا خطرہ جاتا رہا۔ اللہ جل شانہ وعمّ نوالہ نے قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ فرمایا

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ ہم نے قرآن اُتارا ہے اور ہم محافظ ونگہبان ہیں۔

خدا کی یہ شان نہیں کہ وہ سپاہی بن کر قرآن پر پہرہ دے۔ اس کی حفاظت یہی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو توفیق دی کہ انھوں نے یاد کیا، حفاظ بنائے اور مختلف اشیاء پر متعدد اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے کتابت کرائی۔ اس کے بعد خلیفہ اوّل رضؓ نے اس کو ایک جگہ جمع کرنے کا کام کیا۔ یہ کام بھی الہام کے ذریعہ انجام کو پہنچا، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہوا تھا۔ یہ قرآن ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ خلیفہ دوم کے پاس رہا۔ اُنؓ کی شہادت کے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہا۔ موصوفہ امیر المومنین حضرت عمر کی صاحبزادی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ ہیں۔

خلافتِ عمرؓ کے بعد دورِ عثمان رضی اللہ عنہ میں یہ اطلاعات ملیں کہ مختلف ممالک میں قرآن عظیم میں کچھ تغیر وتبدل کیا گیا ہے۔ اس سے موصوف کو بڑی فکر

ہوئی اور بعد مشورہ یہ طے پایا کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قرآن عظیم کے نسخہ سے نقول کرکے کتابت کرائی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور ایک ایک آیت دوبارہ پوری تحقیق سے لکھی گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کاتبینِ وحی سے یہ فرمایا کہ اگر قرأت میں کچھ اختلاف ہو تو لغتِ قریش کو ترجیح دی جائے۔ چونکہ قرآن کا نزول لغتِ قریش میں ہوا ہے۔ متعدد نسخہ جات تیار کیے گئے اور مختلف ممالک میں بھیج دیے گئے۔ اس مصحف کا نام "امام" رکھا گیا۔ یعنی جملہ نسخ قرآن اُس کے موافق رہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ لوگوں کے پاس تھا، اس تھا اس کو دفن کرا دیا گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن میں ترمیم کردی [العیاذ باللہ] امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ کام دورِ صحابہ میں کیا تھا۔ اگر بالفرض وہ نامناسب تغیّر کرتے تو جمہورِ صحابہؓ اُس کو کیسے گوارا کرلیتے۔ دوسرے خدائے برتر کا جو وعدہ ہے کہ "ہم قرآن کے حافظ و نگہبان ہیں" کس طرح پورا ہوتا۔ اللہ جلّ شانہ کی یہ شان نہیں کہ وہ وعدہ خلافی کرے۔ یقیناً یہ قرآن وہی ہے جو دورِ رسالت میں نازل ہوا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو لکھوایا، یاد کرایا۔ جمہور صحابہ اور جمہور اُمت کا اس پر اتفاق ہے۔ اس لیے اگر بعض بے دین اس پر اتہام لگائیں اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو موردِ الزام تصوّر کریں تو یہ سراسر ان کا الحاد ہے۔

حالات مصنّف

مرتبہ : سردار شاہ خاں وجیہی عفی عنہ۔

نام :۔ وجیہ الدین احمد خاں صاحب

ولدیت : عزیز الدین خاں صاحب [مرحوم]

جائے پیدائش۔ محلہ پٹھان خیلان - انگوری باغ - رامپور۔ یوپی۔ گڑھ جلال الدین خاں

تاریخ پیدائش : ۴ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء

مقام تعلیم :۔ مدرسہ عالیہ رامپور۔

دار العلوم دیوبند۔

تدریسی مشاغل:

۱۔ مدرسہ انوار العلوم ۔ رامپور۔

۲۔ مدرسہ امدادیہ مراد آباد

۳۔ مدرسہ قیومیہ شاہجہاں پور

۴۔ مدرسہ حافظیہ سعیدیہ دادوں۔ علی گڑھ

۵ - مدرسہ اصلاح قوم رامپور۔

۶ - مدرسہ اسلامیہ گادباڑی ضلع سلہٹ۔

۷۔ مدرسہ نعمانیہ دہلی۔

۸ - جامعۃ المعارف رامپور

۹ - مدرسہ عالیہ رامپور۔

بانی و ناظم مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ رامپور۔

استاد محترم رامپور کے ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپکے جدِّ اعلیٰ جناب

خیرالدین خاں صاحب یوسف زئی باجوڑ سے تشریف لائے تھے - ملا محمد ظریف خاں جن کی بذریہ مشہور رہے آپ کے ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے - آپ کے والد جناب عزیزالدین خاں صاحب روہیلا لانسرز میں ایک ممتاز سوار کی حیثیت سے مشہور تھے۔

مولانا استاذ محترم کی والدہ نے تین سال کی عمر سے ہی قرآن کریم کی تعلیم دینا شروع کر دی اور سات سال کی عمر تک آپ کو ۲۲ پارے پڑھا دیے۔ پھر آپ کو حفظِ قرآن کے لیے حافظ شمس الدین خاں کے سپرد کر دیا گیا - نو سال کی عمر میں آپ نے حفظ قرآن سے فراغت پائی - اسی دوران حافظ صاحب موصوف نے کچھ اردو اور فارسی کی کتابیں بھی پڑھا دیں - اس کے بعد آپ کو اس دور کے مشہور و معروف بزرگ مولانا سلامت اللہ صاحب کی نگرانی میں عربی کی تعلیم کے لیے دے دیا گیا - ایک سال بعد آپ کے والد کے دوست اور رامپور کے جلیل القدر عالم مولانا وزیر محمد خاں صاحب قادری نے آپ کا امتحان لیا اور تعلیم کی طرف سے مطمئن نہ ہو کر اپنی نگرانی میں لے لیا - اور آپ کا داخلہ مدرسہ عالیہ رامپور کے درجۂ ششم میں کرا دیا اور اپنے طور پر بھی پڑھانا شروع کر دیا - اب تعلیمی سلسلہ بتدریج چلتا رہا یہاں تک کہ آپ نے درجہ اول پاس کر لیا۔

فراغت کے بعد دورۂ حدیث کے لیے اپنے استاذ اور پیر و مرشد کے مشورے سے دیوبند چلے گئے - وہاں مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے دورہ پڑھا دیوبند میں قیام کے دوران کچھ طالب علموں کے اصرار پر "صدرا" جو کہ ایک سخت کتاب ہے پڑھانی شروع کی - نائب مہتمم صاحب نے ایک روز چھپ کر آپ کے پڑھانے کو سنا اور آپ اس سے متاثر ہوئے - آپ کو دیوبند میں ملازمت کی پیشکش کی آپ کے انکار کو تنخواہ کی کمی پر محمول فرما کر آپ کو بھوپال اور حیدر آباد کی ریاستوں میں بڑی تنخواہوں پر بھیج دینے کو فرمایا لیکن آپ نے صاف جواب دے دیا کہ "میرے استاذ محترم اس بات کا فیصلہ کریں گے" اور پھر واپسی میں آپ نے سب سے پہلے مدرسہ انوار العلوم میں تدریسی خدمت انجام دی۔